وملک کے لئے کوئی غیر معمولی تاثیر یا تبصرت پائی جاتی تھی اور ہمیشہ ان انسانی برائیوں اور عظمتوں کی یادکو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں اور قومی مجموعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا۔ جن کے اندر خود اس قوم کی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے۔

پہلی چیز جس کو تمام اقوام متحدہ نے ''مشاہیر پرستی'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محب الوطنوں اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہومرؔ نے ایلیڈ لکھی۔ سیالڈ یا کے حجری کتب خانے میں دو اینٹیں رکھی گئیں جن پر نامور ان ملت کے مناقب ومحامد کندہ تھے۔ عرب جاہلیت نے اپنے سلسلہ انساب کا ایک حرف ضائع ہونے نہ دیا اور ذوالمجاز اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر ومعالی کی داستان سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے منار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم واستوار ہیں۔ اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا ہندوستان نے اپنے مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لئے تھے کہ اسلاف ومشاہیر کی یاد زندہ وقائم رکھی جائے۔

آج اوقیانوس کا بحری مسافر واشنگٹن کے بت کو ساحل امریکہ سے دیکھ کر دور سے پکار اُٹھتا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں اور ان کی محکوم نو آبادیوں کی شہراہوں اور باغوں میں جا بجا سنگی بت نصب نظر آتے ہیں۔ شیکسپیر کا مولد اب تک قائم ہے ملٹن ومیز کو مرنے نہیں دیا جاتا جانسن کے آثار اب بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے میدان میں ایک جگہ یہ سگی کتبہ تم پڑھو گے ''پاک منبر نبی نے یہاں اپنا بچپن گزارا تھا۔''

یہ سب کچھ بھی اسی مشاہیر پرستی کی ایک زیادہ خوش نما اور دلفریب شکل ہے۔ جو پہلے محض قومی روایتوں اور افسانہ طرازیوں کے ذریعہ قائم رکھی جاتی ہے۔

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار ویادگار کا اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا، یا کسی نام کو

فراموش نہ ہونے دینا ہی نہیں تھا۔ بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے کسی خاص نام، کسی خاص واقعہ کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی، پچھلوں کو اگر محض یاد ہی رکھنا ہے تو اس کے لئے بڑا اور چھوٹا۔ ادنیٰ و اعلیٰ نیک و بد سب یکساں ہیں کون سی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور ہنے بال کو یاد رکھا جائے اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے، جو اسی عہد میں گزرا تھا۔

دعوتِ عمل

سو وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماع انسانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے اور اصل ناموں وجودوں شخصیتوں اور محض تذکرہ و یاد آوری سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ عزائم مہمہ، نتائج عظمیہ، اور بصائر و مواعظ جلیلہ ان مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں، اور جن کی یاد اور تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ حی و قائم رکھا جائے اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں

> پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوت درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت وبصیرت کی زبان سے نکلے تمہاری آنکھیں اس حادثے پر بہت رو چکی ہیں مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے۔

جن کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمال حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

★★★★★

تعاون کی گذارش

تمام صاحبان قلم اور شعراء کرام سے گذارش ہے کہ مذہبی و سماجی موضوعات پر اپنے رشحات قلم ہدیٰ مشن کو ارسال فرمائیں

عالیجناب مولانا سید شمشاد حسین رضوی اُترولوی صاحب

یہ آواز کس کو کہنے کا حق ہے اور کس کو نہیں؟؟ جو اصول دین اور فروع دین پر گامزن ہے یا کسی بھی طرح کسی پر بھی نہیں۔۔۔! کون دعویدار ہے اور کون عملی جامہ پہنے ہوئے ہے کون انگشت نمائی کرے اور کس کو محاسبہ کا حق دیا گیا ہے۔بس ہم ہیں اور بس ہم۔۔ یا میں ہوں اور میں ہی۔۔۔دوسرا کوئی نہیں۔؟ سماج کتنا بیمار ہے، معاشرہ میں کتنی عفونت پھیلی ہوئی ہے، کون معالج اور کون طبیب۔۔! سب کے پاس دوا ہے اور ہر ایک کو مشورہ دینے کا اختیار ہے، مشیر و مستشار کا فرق معلوم نہیں، آسمان کے قلابے جوڑے بیٹھے سر دُھن رہے ہیں۔

جس نے "ھل من ناصر ینصرنا" کی "آوازِ استغاثہ" بلند کی تھی وہ صدا بہ صحرا نہ ہوئی۔۔۔ دشت و جبل نے لبیک کہا، طیور و وحوش نے اس آواز پر صحرائے کربلا میں حاضری دی، جن و ملائک اور کروبیوں نے گریہ و بکا کر کے امامؑ سے لڑنے کی اجازت چاہی، ارواحِ انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام نے لبیک کہا اور سب کی ایک مشترک آواز تھی: "یا حسینؑ"، "یا حسینؑ"، "یا حسینؑ" "یا حسینؑ"، "یا حسینؑ"۔۔۔۔۔۔۔!!

مگر نہ کہی "یا حسین" تو اُن سنگ دل مُردہ دِلوں نے جو بظاہر انسان تو تھے مگر چلتی پھرتی لاشیں تھیں۔کیا ہم بھی اپنی گردنوں پر اپنے سروں کو بوجھ محسوس نہیں کرتے جو مقصدِ حسینؑ میں دینے کے لئے کسی بھی وقت حاضر نہیں، فقط دعویٰ بے دلیل، کیا حضرت امام حسین علیہ السلام اب بھی ہم سے کچھ

مانگ رہے ہیں؟؟ اگر ''ہاں'' تو اس کا کیا جواب ہے۔۔۔ اور اگر ''نہیں'' تو پھر اس ''یا حسینؑ'' کا مقصد کیا ہے۔ ہم اپنی حاجتیں ان کے توسط سے طلب کر رہے ہیں اور خوش و مطمئن ہو رہے ہیں، یا انھیں کچھ دے رہے ہیں۔؟ بڑے سوالات و تساؤلات ہیں۔ کس کس سے اور کس سے نہیں؟ صرف مَردوں سے ہے یا عورتوں سے۔؟ جوانوں اور بوڑھوں سے یا صحت منداور بیماروں سے۔؟ بھوکوں اور شکم سیر لوگوں سے، پیاسوں اور سیرابوں سے۔؟

فقراء اور ثروت مندوں سے۔؟ خوشحال لوگوں اور پریشان حال لوگوں سے۔؟ طلاق شدہ یا بیوہ سے۔؟ کنوارے اور شادی شدہ سے۔؟ بے اولاد اور اولاد والے سے۔؟ بے پردہ یا با پردہ سے۔؟ امتحان میں پاس ہونے والے اور فیل ہونے والے سے۔؟ عوام اور خواص سے۔؟ جاہل اور عالم سے۔؟ عالمِ باعمل اور عالمِ بے عمل سے۔؟ مجتہد اور مقلد سے۔؟ واعظ و مبلّغ سے یا سامع و مستمع سے۔؟ نمازی و روزہ دار یا تارک الصلوٰۃ و روزہ خور سے۔؟ حاجی یا زائر اور پیسے کے لالچی اور کنجوس سے۔؟ اخباری اور ملنگ سے یا شہادتِ ثالثہ کے قائل و مروّج یا صحیح تشہد پڑھنے والے اور مدافع سے۔؟ دیندار اور بے دین سے۔؟ زنجیر و قمع کے معتقد و عامل سے، یا نامِ حسینؑ پر انسانیت کے نام خون دینے والے سے۔؟ جان بوجھ کر بے عمل و بدکردار یا لاشعور اور غافل سے۔؟

وغیرہ وغیرہ۔۔۔ طبقہ بندی اور درجہ بندی بہت ہے اور بہت کی جاسکتی ہے۔ مگر سوال وہیں پر ابھی تک موجود ہے کہ کسے یہ آواز ''یا حسینؑ'' کہنے کا حق ہے اور کس کو نہیں یا پھر سب کو ہے۔۔۔؟؟

جواب ہر ایک کے پاس ہے اور ہر کوئی کہنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اس میں ''صرف اور صرف'' ایک بات ہے اور وہ ہے ''انصاف کے ساتھ احتساب کی'' یا ''اپنے آپ کو گریبان میں جھانکنے کی'' ۔۔۔! نہ کوئی ماننے کو تیار ہے اِلّا معدودِ چند کے۔ (اللہ انھیں جزائے خیر دے)۔ مگر کچھ تو ہیں کہ سب چیز کی ٹھیکیداری لئے بیٹھے ہیں۔ خاندان پرستی، جاگیرداری، ''ہم چنیں دیگرے نیست'' ریاست طلبی۔۔۔ مجھے نہ کچھ کہو کیونکہ میں سب کو کہہ سکتا ہوں۔۔۔ مجھ میں کوئی عیب نہیں دوسرا ہی قصوردار اور خطا کار ہے۔۔۔ دوسروں کا حق مارے بیٹھے ہوئے ہیں مگر اس طرف کسی کا کوئی ذہن جاتا نہیں۔ غاصبِ حقوق الناس ہی نہیں بلکہ غاصبِ حقوق اللہ و رسولؐ اور اہلبیت علیہم السلام بھی۔۔۔۔!

قولِ مولا حسینؑ: ''کیف استسقی لطفلی'' میں اپنے بچے کے لئے کس طرح پانی طلب کر رہا تھا۔۔۔واقعی یہ جملہ زیادہ اہم اور وزنی ہے یا آواز استغاثہ: ''ھل من ناصر ینصرنا'' کون ہے جو میری مدد کو آئے۔۔یہ تو معصومؑ ہی کی زبان بتا سکے گی۔مگر خود مولاؑ نے جب کسی صحابی کو (شبِ عاشور یا روزِ عاشور) کربلا سے چلے جانے کی اجازت دے دی تھی تو یہی فرمایا تھا کہ: تم اُن حدود سے بہت پہلے باہر نکل جاؤ جہاں تک میری آواز استغاثہ تمھارے کانوں تک پہنچے۔ یہ امر واقعی ہے کہ'' آوازِ استغاثہ'' کی بہت ہی اہمیت ہے۔اب موضوع ''لبیک'' کا شروع ہوتا ہے اور نفسِ امارہ کی اطاعت اور اسے رب بنانے کی بات ہے۔ (سورہ فرقان آیت ۴۳)

دیکھنا ہے کہ اب ہم کہاں ہیں۔۔۔خدانخواستہ نہ کسی پر جارحانہ حملہ ہے اور نہ ہی بدظنی اور غلط فہمی کا شکار ہونے کی۔۔بات یہ ہے کہ ہم ''لبیک'' کہہ رہے ہیں تو مفہوم لبیک ادا کر پا رہے ہیں یا نہیں۔زبانی ہے یا حلق سے نیچے اترا بھی ہے۔

ہاں آیئے ایک بار صحیح ''توبہ واستغفار'' کریں اور حضرتِ حُرؑ کے غلام و بیٹے کے نقشِ قدم نہیں پر ہی نہیں، بلکہ ان کے پاؤں کے تلووں کی خاک کو سُرمہ بنانے کا عقیدہ دلوں میں راسخ کریں پھر تو'' یا حسینؑ'' کی صدا بھی اچھی لگے گی اور امامؑ بھی اسی طرح جواب دیں گے جیسا کہ ''ایک جوانِ صالح اپنے والدین کو کاندھے پر بٹھا کر کربلا زیارت کرانے لایا اور خلوص کی اس وقت معراج تھی کہ جب اس جوان نے ''السلام علیک یا ابا عبداللہ'' کہہ کر سلام کیا تو مولاؑ نے ایسا جواب دیا کہ پورے حرم نے سنا۔اور وہ ''مجاب'' (یعنی جس کو جواب ملا) کے نام سے مشہور ہوا۔

اے کاش ہماری زندگیاں ایسی ہوں کہ مولاؑ کی بارگاہ میں جائیں تو یہ سوچیں کہ اب ہم کہاں کھڑے ہیں اور کس کو سلام کر رہے ہیں۔؟ یہ کربلا میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ سے یہی خیال ہونا چاہئے کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت ناظر ہیں۔جیسا کہ ہمارے امام زمان عجل اللہ فرجہ الشریف نے فرمایا ہے کہ ہم تمھارا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔بس اس فکر و عمل میں ''یا حسینؑ'' کہنا کامیابی کی دلیل ہوگی۔

اللھم ارزقنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

★★★★★

شیعہ اور عزاداری

عالیجناب مولانا محمد حسن معروفی صاحب

تشیع کے معانی نسبت، مشایعت، متابعت اور ولاء کے ہیں، لفظ شیعہ قرآن میں کئی جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً سورۂ صافات کی آیت نمبر ۸۳ میں لفظ شیعہ یوں استعمال ہوا ہے۔ ”وَإِنَّ مِن شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ“ ان (نوح) کے شیعوں میں ابراہیم بھی ہیں جب وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں قلب سلیم کے ساتھ آئے۔

لیکن اسناد تاریخ اسلام میں لفظ شیعہ اہل بیت رسولؐ سے محبت ونسبت اور ان کے مکتب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے شہرت پاچکا ہے۔ یعنی ولاء اہلبیت رکھنے والوں کو شیعہ کہا جاتا ہے اور ”ولاء“ کے بہت سارے عناصر ہیں جنکے اجتماع سے ولاء کا واقعی مفہوم وجود پاتا ہے لیکن اس مضمون میں سارے عناصر ولاء پر گفتگو ممکن نہیں ہے کچھ عناصر جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں ان کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

رنج وغم اور خوشی ومسرت:

یہ دونوں اصل میں ”ولاء“ کی دو اصالت کا نام ہے یعنی یہ دونوں ولاء اور محبت کی نشانیاں ہیں اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہے اور محبت حسن تدریجی پاک پاکیزہ اور شدید ہوتی ہے اسی کے اعتبار ومناسبت سے محبت کرنے والا محبوب کے رنجور ومغموم ہونے سے خود بھی مغموم ورنجور ہوتا

ہے اور محبوب کے سرور وخوشی سے مسرور اور خوش ہوتا ہے اور ایسا ہونا سچی محبت کی روح و جان اور دوسروں کے لئے پہچان ہے۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ فرمان بطور تائید پیش ہے۔

ہمارے شیعہ ہم سے ہیں ان کو بھی انھیں چیزوں سے رنج واذیت ہوتی ہے جن سے ہمیں رنج ہوتا ہے اور انھیں چیزوں سے مسرور ہوتے ہیں جن سے ہم مسرور ہوتے ہیں۔

(امالی طوسی ج ۱ ص ۳۰۵)

ہمارے اوپر ہونے والے ظلم پر رنجیدہ ہونے والے کی سانس تسبیح، ہمارے لئے اہتمام کرنا عبادت اور ہمارے راز کو چھپانا راہ خدا میں جہاد ہے۔ (امالی مفید ص ۲۰۰)

اسی طرح بکر بن محمد ازدی نے امام صادق علیہ السلام سے ہی روایت کی ہے کہ آپ نے فضل سے فرمایا کیا تم لوگ کہیں جمع ہوکر بیٹھتے اور ہمارا ذکر کرتے ہو تو فضل نے جواب میں کہا: ہماری جانیں آپ پر فربان ہاں ہم ایسا کرتے ہیں۔آپ نے فرمایا ہم ایسی مجلسوں کو پسند کرتے ہیں لہٰذا تم لوگ جمع ہوکر ہمارے امر کو زندہ کرو اور خدا اس پر رحم کرے جس نے ہمارے امر کو زندہ کیا۔

(بحار الانوار ج ۴۴ ص ۲۸۲)

گویا ولاء اہلبیت کا عظیم عنصر عزاداری ہے اور آج پوری دنیا میں عزاداری ہی سے شیعہ قوم جانی اور پہچانی بھی جاتی ہے یعنی اسلام کے تمام احکام مسلمان ہونے کی علامت ہیں تو عزاداری ہی شیعہ ہونے کی پہچان ہے کیونکہ شیعہ کا مطلب ہے ''ولاء اہلبیتؑ رسولؐ'' اور ولاء کی علامت اور نشانی محبوب کے غم وخوشی کا عملی مظاہرہ ہے۔

شیعہ ہونے کی ذمہ داری:

جب کسی فرد یا شخص کے ساتھ کوئی عنوان منسلک ہوجاتا ہے تو وہ عنوان اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کا اعلان ہوتا ہے، مثلاً کسی شخص کے ساتھ عالم، معلم، قاضی، صدر، سکریٹری، انجینئر، ڈاکٹر، تاجر، کسان، سپاہی یا کلرک وغیرہ، جس کے ساتھ جو عنوان بھی منسلک ہے اس صاحب عنوان کو ہمہ وقت، ہمہ تن متوجہ رہنا چاہئے کہ میرا عہدہ یا مجھ سے منسلک میرا عنوان مجھ سے کیا کہہ رہا ہے کیا چاہتا ہے، اس لئے کہ عہدہ وعنوان کے مطابق عمل کرنے والا انسان ہر جہت سے کامیاب وکامران رہتا ہے اور

کامیابی وکامرانی عزت ورفعت انسان کی دیرینہ آرزو ہوتی ہے۔

جس طرح سے ایک فرد یا شخص صاحب عہدہ یا عنوان سے منسلک ہوتا ہے اسی طرح ایک سماج معاشرہ یا فرد کسی عنوان سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔مثلاً مذاہب ومسالک یا قوم وملت سے منسوب شیعہ، سنی، یہودی، عیسائی یا ہندوستانی ایرانی یا پاکستانی جیسے عناوین۔ایسے عناوین انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی ذمہ داریوں کی علامت ہوتے ہیں جو صاحبان عناوین کو دعوت دیتے ہیں۔

کامیاب سماج ومعاشرہ یا قوم وملت بننے اور بنانے کے لئے ذمہ داریوں پر عمل ضروری ہے اور شعیہ ہونا تو بہت ہی ذمہ داری کی علامت اور ذمہ دار ہونے کا اعلان ہے۔ اس لئے کہ مسلک شیعہ میں ایمان کی تعریف صرف زبان سے اقرار اور قلبی اعتبار ہی نہیں ہے بلکہ اعضاء وجوارح سے عمل بھی ایمان کی تعریف کا جزء ہے۔لہٰذا جو اپنے کو شیعہ کہتا اور سمجھتا ہے اسے اپنی ذمہ داریوں کو بھی جاننا اور سمجھنا اور سمجھ کر عمل کرنا بھی چاہئے ہے، اسے ہر وقت اپنے سے سوال کرتے رہنا چاہئے کہ میں کتنا ذمہ دار ہوں اور کس قدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہا ہوں۔

شیعہ معصومینؑ کی نظر میں:

اس سلسلہ میں معصومین علیہم السلام سے کثرت کے ساتھ احادیث ہیں اور ہر حدیث اور قول معصوم کسی نہ کسی عنوان سے شیعہ ہونے کی علامت یا ہونے کی ذمہ داری کو بتاتا ہے یہاں صرف ایک حدیث اور اس پر تجزیہ پیش ہے۔

محمد بن عمران نے اپنے والد سے انھوں نے امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ امامؑ نے فرمایا: میں ایک دن اپنے والد (یعنی امام محمد باقر علیہ السلام) کے ہمراہ مسجد گیا تو دیکھا منبر اور قبر رسول کے مابین آپ اصحاب (شیعہ) کی ایک جماعت بیٹھی ہے میرے والد اُن کے قریب گئے اور سلام کے بعد فرمایا میں تمہاری خوشبو اور روحوں کو دوست رکھتا ہوں اس سلسلے میں تم ورع وتقویٰ اور سعی وجانفشانی کے ذریعہ میری مدد کرو۔ (بحار الانوار ج ۲۸، ص ۶۶)

اس حدیث میں دو جملے بہت قابل توجہ ہیں۔

۱: میں تمہاری خوشبو اور روحوں سے محبت کرتا ہوں۔

۲: ورع وجانفشانی کے ذریعہ میری مدد کرو۔

پہلا جملہ امامؑ کی طرف سے محبت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اپنے شیعوں میں جنت کی خشبو پاتے ہیں محبت کے اظہار کے لئے اس سے زیادہ بلیغ جملہ شاید ممکن نہیں ہے۔

اور دوسرے جملے میں طرفین کی محبت میں دوام واستحکام کے اصول وضوابط بتائے ہیں کہ ورع و تقوی اور طاعت وعبودیت کے دریعہ ہماری مدد کرو۔

یعنی اہلبیت علیہم السلام کی اپنے شیعوں سے محبت کی مثال ایسی ہے جیسی باپ کی محبت اولاد سے ہوتی ہے اور باپ چاہتا ہے کہ بیٹا اپنے اخلاق و آداب سے میری محبت کا اہل رہے کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے باپ کی عزت پر حرف آئے اور باپ کی محبت کم یا ختم ہوجائے، اس لئے امامؑ نے ارشادفرمایا ہے تم جانفشانی سے ہماری مدد کرو۔

اہمیت عزاداری سید الشہداءؑ:

عزادرای کی اہمیت وعظمت اظہر من الشّمس ہے اور جیسا کہ میں نے ذکر بھی کیا کہ شیعہ کا مطلب ہے ولاء اہلبیتؑ اور اور ولاء کی علامت و پہچان ہے محبوب کے غم میں مغوم ہونا اور خوشی میں خوش ہونا تو عزادرای ہی شیعہ ہونے کا عملی اعلان ہے خود معصومین علیہم السلام نے عزاداری کی ہے اور حکم بھی دیا ہے اور عزاداری کے ثواب وانجام کو بھی بتایا ہے۔

ریان بن شبیب راوی ہیں کہ میں محرم کی پہلی تارخ کو امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے ایک طویل حدیث کے بعد فرمایا: اے فرزند شبیب اگر تمہیں کسی چیز پر رونا آئے تو امام حسینؑ پر رونا اس لئے کہ انہیں بڑی بے دردی سے ذبح کیا گیا ہے اور ان کے اہلبیتؑ سے اٹھارہ ایسے مرد قتل ہوئے ہیں جن کی مثال روئے زمین پر نہیں ہے۔

فرزند شبیب اگر تم جنت کے محل میں انہی کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو قاتلان حسینؑ پر لعنت کرو شبیب کے بیٹے اگر تم حسینؑ کے ساتھ شہید ہونے والوں کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہو تو جب بھی حسینؑ کی یاد آئے یہ کہا کرو۔ "یَالَیۡتَنِی کُنۡتُ مَعَھُمۡ فَأَفُوزَ فَوۡزاً عَظِیماً"

فرزند شبیب اگر تم جنت کے بلند درجات میں ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ہمارے غم میں غم

اور ہماری خوشی میں خوشی مناؤ اور ہماری ولایت سے متمسک رہو کیونکہ اگر کوئی شخص پتھر سے بھی محبت کریگا تو خدا روز قیامت اسی کے ساتھ محشور کریگا۔ (امالی صدوق، ص ۵۷، مجلس ۲۷)

مذکورہ حدیث میں یہ جملہ بہت قابل توجہ ہے جس سے جنت اور محل میں ربط کا پتہ چلتا ہے۔

"يَا ابْنَ شَبِيبٍ إِنْ سَرَّكَ أَنْ يَكُونَ لَكَ مِنَ الثَّوَابِ مِثْلُ مَا لِمَنِ اسْتُشْهِدَ مَعَ الْحُسَيْنِ فَقُلْ مَتَى مَا ذَكَرْتَهُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزاً عَظِيماً"

فرزند شبیب! اگر تم امام حسینؑ کے ساتھ شہادت کا درجہ پانے والے کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہو تو جب بھی امامؑ کو یاد کرو تو یہ کہا کرو: (کاش کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو عظیم کامیابی حاصل کر لیتا)

بلا شک وشبہ نیت وعمل میں بہت گہرا ربط ہے اگر نیت سچی اور حقیقی ہو اور نیت کے مطابق عمل کا موقعہ دنیا کی زندگی میں نہ آ سکے تو قیامت کے دن اللہ اس سچی نیت کو عمل قرار دیکر اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

جیسا سید رضیؒ نے نہج البلاغ میں نقل فرمایا ہے کہ جب اللہ نے اہل جمل پر حضرت علیؑ کو فتح عطا کی تو آپ کے ایک صحابی نے آپ کے پاس آ کر کہا، اے کاش کہ میرا فلان بھا کی بھی ہوتا اور آپؑ کی اس فتح وکامرانی کو دیکھتا جو اللہ نے آپؑ کو دی ہے، امامؑ نے پوچھا کیا تمہارا بھائی ہمیں دوست رکھتا ہے؟ اس شخص نے کہا، ہاں! تب امامؑ نے فرمایا وہ موجود تھا اور وہ تنہا نہیں تھا بلکہ وہ سارے لوگ تھے جو ہمارے چاہنے والے صلبوں اور رحموں میں ہیں۔

جس طرح اللہ نیک نیت کو نیک عمل کی جگہ قرار دیتا ہے ویسے ہی کسی کے برے اعمال پر انصاف اور اس کے خلاف صدا بلند نہ کرنے والوں کو بھی بروں کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔

جیسا کہ محمد بن الارقط راوی ہیں کہ میں نے مدینہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملاقات کی تو آپؑ نے مجھ سے پوچھا۔ تم کوفہ سے آئے ہو؟ میں نے کہا: ہاں، آپؑ نے دوسرا سوال کیا کہ کیا تم امام حسینؑ کے قاتلوں کو بھی دیکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: میری جان آپ پر قربان میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ پھر آپؑ نے فرمایا کہ اگر قاتلان حسینؑ کو نہیں دیکھا یا نہیں دیکھتے تو کیا قتل حسینؑ کے ذمہ داروں کو بھی نہیں دیکھتے؟ کیا تم نے اللہ کا ارشاد نہیں پڑھا ہے:

"قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ"

(آل عمران: ۱۸۳)

اس آیۂ کریمہ میں اللہ نے اپنے حبیب کے ذریعہ جن لوگوں کو مخاطب کیا ہے اور پوچھا ہے تم لوگوں نے نبیوں کو کیوں قتل کیا؟ تو کیا واقعا ان لوگوں نے قتل کیا تھا جب کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مصطفیٰؐ کے درمیان کوئی نبی تھا ہی نہیں، اصل میں لوگ رسول کے قتل پر راضی تھے قاتلوں کے خلاف آواز نہیں بلند کرتے قاتلوں سے بیزاری کا اعلان نہیں کرتے تھے۔

اسلام کے تمام احکام مسلمان ہونے کی علامت ہیں تو عزاداری ہی شیعہ ہونے کی پہچان ہے کیونکہ شیعہ کا مطلب ہے ''ولاء اہلبیتؑ رسولؐ'' اور ولاء کی علامت اور نشانی محبوب کے غم وخوشی کا عملی مظاہرہ ہے۔

اس روایت سے واضح ہے کہ عزاداری ایک رسم نہیں بلکہ ظلم، ظالم، قتل اور قاتل سے اعلان برائت ہے اس لئے عزاداری کی اہمیت عبادت جیسی ہے۔

سلیقۂ عزاء اور نتیجہ عزاء:

کسی بھی عمل کی غرض وغایت بہرحال ہوتی ہے اور غرض وغایت تک پہونچنے کے لئے عمل کا طور طریقہ اور سلیقہ ہوتا ہے کبھی طور طریقہ ہمیشہ کے لئے معین کردیا جاتا ہے بلکہ غرض وغایت کا حصول اسی معین طریقہ کو اپنانے سے ممکن ہے عمل میں ذرا سی بھی تبدیلی نتیجہ سے دوری کا سبب ہوجائیگی جیسے نماز روزہ حج وغیرہ۔

لیکن بعض اعمال کی بجاآوری کے طور طریقے زمان ومکان سے وابستہ ومربوط ہوتے ہیں جیسا وقت اور جیسا زمانہ ہو اس کو پیش نظر رکھ کر اسی کے مطابق عمل کیا جائے تو بہتر نتیجہ حاصل ہوگا جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا کوئی معین طریقہ نہیں ہے بلکہ حالات، زمان ومکان کمیت وکیفیت وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے عملی اقدام کی شکل وصورت اور طور طریقہ اختیار کیا جائیگا۔

عزاداری بھی بلامقصد اور بلاغرض وغایت نہیں ہے البتہ اس کا کوئی معین ومرتب طور طریقہ نہیں

ہے بلکہ مقصد اور غرض و غایت تک اچھے اور موثر انداز میں پہونچنے کے لئے زمان و مکان اور حالات کو دیکھتے ہوئے سلیقۂ عزاء اختیار کرنا چاہئے اور یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ جب عمل کرنے والا اور عمل کے ذریعہ دوسروں کو دعوت دینے والا خود عمل سے پوری طرح متاثر نہ ہوگا دوسروں کو متاثر نہیں کرسکتا ہے۔ بہر حال سلیقۂ عزاء زمانی و مکانی ہے اور نتیجہ عزا یزیدیت یعنی برائیوں سے عملی چھٹکارا ہے اور حسینیت بھی اچھائیوں سے عملی لگاؤ ہے۔

★★★★★

ھدیٰ مشن

ممبرشپ فارم

مصباح الھدیٰ (اردو) -/200

مصباح الھدیٰ (ہندی) -/200

ماہنامہ طوبیٰ -/300

Name: Mr./Mrs./Miss

Father/Husband'sName:

Address:

City/Vill.: Post :

Distt.: State:

Pin: Mobile No:

Phone e-mail:

मौजूदा सब्सक्राइबर्स अपनी कस्टमर ID लिखें: Date ..... Signature.....

Huda Mission, Shifaat Market, Zahra Colony, Muftiganj, Lucknow-3
9415090034, 9451085885, 8726254727

رقم کے ہمراہ اس فارم کی کاپی روانہ فرمائیں

قاتلان امام حسینؑ کون تھے؟

تحریر: حجۃ الاسلام والمسلمین آقای علی اصغر رضوانی ترجمہ: منظر صادق زیدی

شیعوں پر کئے جانے والے بے بنیاد اعتراضات میں سے ایک الزام یہ بھی ہے کہ امام حسینؑ کے قاتل خود شیعہ ہی تھے۔ آخری دور میں اس الزام کا رواج نسبتاً زیادہ ہوگیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کربلا میں موجود عمر سعد کے لشکر کا بڑا حصہ کوفیوں کا تھا اور اس زمانہ میں کوفہ، شیعیان علی ابن ابی طالبؑ کا مرکز تھا۔ لہذا شیعہ جو عزاداری اور گریہ و ماتم کرتے ہیں درحقیقت یہ اشک ندامت ہے کہ انھوں نے فرزند رسولؐ کو قتل کر ڈالا۔

سید علی جلال حسینی مصری اپنی کتاب ''الحسینؑ'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ''امام حسینؑ کے سلسلہ میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان کے شیعوں نے ہی انھیں قتل کر ڈالا اور پھر خود ہی ان کی شہادت کے دن پوری دنیا میں عزاداری کرتے ہیں اور ان کا سوگ مناتے ہیں۔'' (اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۵۸۴، ۵۸۵)

آیئے ہم اس مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ امام حسینؑ کے قاتل کون تھے؟ اور ان کا مذہب کیا تھا؟

تشیع کے پہلو

اکثر و بیشتر مختلف جہات اور اعتبار سے لوگوں کی جانب تشیع کی نسبت دی جاتی رہی ہے اور لوگوں کو شیعہ کہا جاتا رہا ہے جن میں سے چار اعتبار نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱۔تفضیل کے قائل

تفضیلی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ تمام صحابہ حتی کہ خلفاء سے بھی افضل و برتر تھے نیز یہ کہ خوارج، اصحاب صفین اور اصحاب جمل کے ساتھ جو جنگیں ہوئی ہیں ان میں آپؑ ہی حق پر تھے۔

تاریخ اسلام میں ایسے افراد کل بھی تھے اور آج بھی ہیں کہ جو ایک خاص سیاسی فکر کے قائل ہیں۔ یہ حضرات اہلبیتؑ کی رہبری و قیادت کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اس بناء پر نہیں کہ ائمہ معصومینؑ منصوص و منصوب من اللہ ہیں بلکہ اس عنوان سے تسلیم کرتے ہیں کہ ائمہ معصومین سب سے افضل و برتر ہیں۔ان حضرات کو ہم ''سیاسی شیعہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔

بہت سے تابعین اور محدثین کے یہاں یہ طرز فکر پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ اہلبیتؑ اطہار کو سیاسی اور حکومتی معاملات میں دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں لہذا ان کو سیاسی شیعہ کہا جاتا ہے برخلاف اہلسنت کے اس گروہ کے جو بہرصورت حکومت وخلافت کے طرفدار ہیں۔

یہ نظریہ اہل سنت کی رجال اور جرح وتعدیل کی کتابوں میں بھی نظر آتا ہے اس لئے کہ پہلی، دوسری اور تیسری صدی کی بہت سی شخصیات کو محض اسی معیار کی بناء پر ''شیعہ'' قرار دے دیا گیا اور بہت سے افراد کا تعارف ''فیہ تشیع یسیر'' (ان میں تھوڑی شیعیت پائی جاتی ہے) سے کرایا گیا ہے۔اہل سنت کی یہ وہی شخصیات ہیں جو امیر المومنینؑ کو دیگر خلفاء خصوصاً عثمان سے افضل و برتر تسلیم کرتی ہیں۔

۲۔صحیح العقیدہ شیعہ

صحیح العقیدہ شیعہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اہلبیت اطہار کو منصوص من اللہ تسلیم کیا جائے اور اس امامت وخلافت، جانشینی اور دینی مرجعیت کا عقیدہ رکھا جائے جس کا سلسلہ امیر المومنین حضرت علیؑ سے شروع ہوتا ہے۔ ارشادات قرآنی وفرمودات نبویؐ پر مبنی یہ نظریہ حیات پیغمبر اکرمؐ میں ہی صحابہ کے درمیان موجود تھا۔بعض مخلص صحابہ جو کہ نص کے مقابلہ میں اجتہاد کے قائل نہیں تھے وہ روز اول سے ہی حکم خدا اور رسولؐ کے سبب حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ کا ولی، وصی اور جانشین تسلیم کرتے تھے۔یہی نظریہ اور عقیدہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں آگے بڑھتا رہا۔

اہلبیت اطہارؑ کو اگر چہ سیاسی اقتدار اور قیادت و رہبری سے محروم کر دیا گیا لیکن دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اہلبیتؑ کی دینی، علمی، فقہی مرکزیت اور برتری مکمل طور پر آشکار ہو چکی تھی۔

امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کے صحابی ابان بن تغلب شیعہ کا تعارف ان الفاظ سے کراتے ہیں ''رسول خدا سے حاصل ہونے والے کسی مسئلہ میں اگر اختلاف ہو جائے تو شیعہ اسے کہا جاتا ہے کہ جو حضرت علیؑ کی جانب رجوع کرے اور آپؑ سے ہی حکم خدا اخذ کرے اور اگر حضرت علیؑ سے حاصل ہونے والے کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو جعفر ابن محمدؑ کی جانب رجوع کرے''۔

(رجال نجاشی ص ۹)

۳۔ محبت کرنے والے

مسلمانوں کے درمیان تشیع کی ایک اور قسم نظر آتی ہے جسے ہم ''محبت کی بنیاد پر شیعیت'' کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ اہلسنت کے علماء رجال کی اصطلاح کے مطابق کچھ لوگوں پر محبت اہلبیتؑ کی بناء پر بھی شیعیت کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ احادیث نبوی میں اہلبیتؑ کے فضائل و مناقب سے متعلق بیشمار روایات موجود ہیں لہذا اہلسنت کے بہت سے افراد اہلبیتؑ سے شدید محبت کرتے ہیں اسی لئے انھیں بھی شیعہ قرار دے دیا گیا۔ ایسے افراد کی فہرست میں ''عقد الفرید'' کے مصنف ابن عبدربہ اندلسی اور محمد ابن ادریس شافعی کا نام بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ شافعی ایک شعر میں کہتے ہیں۔

ان کان حب الولی رفضا فاننی ارفض العباد

اگر ولی (علیؑ) کی محبت رافضی ہونے کا سبب ہے تو میں بندگان خدا میں سب سے بڑا رافضی ہوں۔

۴۔ دینی شیعیت

تشیع کی چوتھی قسم کو ہم دینی و ثقافتی تشیع سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق اہلبیت اطہارؑ صرف دینی و فقہی اور تفسیری اعتبار سے لوگوں کے ملجا و ماوی اور مرجع ہیں اور معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ ان مسائل میں اہلبیتؑ کے جانب رجوع کرے۔ اور ایسے افراد کی کمی بھی نہیں ہے کہ

جو اہلبیتؑ کی عظمت وعلمیت کے قائل ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی وحکومتی معاملات میں اہل سنت کا اتباع کرتے ہیں ۔ایسے افراد کا خیال ہے کہ اہلبیتؑ کی امامت و وصایت کے بارے میں قرآنی آیات یا روایات میں کوئی نص نہیں ہے لیکن یہ لوگ علم اور دینی مسائل میں اہلبیتؑ کو دوسروں سے افضل و برتر مانتے ہیں۔ملل ونحل کے مصنف شہرستانی کو اسی قسم میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

> صحیح العقیدہ شیعہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اہلبیتؑ اطہار کو منصوص من اللہ تسلیم کیا جائے اور اس امامت وخلافت، جانشینی اور دینی مرجعیت کا عقیدہ رکھا جائے جس کا سلسلہ امیر المومنین حضرت علیؑ سے شروع ہوتا ہے۔

حقیقی شیعہ کون؟

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ زبانی طور پر کسی عقیدہ یا نظریہ کے قائل ہوں لیکن عمل کے اعتبار سے ان کا اس عقیدہ یا نظریہ سے تعلق نہ ہو اور میدان عمل میں ثابت قدم نہ رہتے ہوں۔بعض حضرات مدعی ہوتے ہیں کہ ہم فلاں دین کو مانتے ہیں ہیں لیکن اس دین کے بنیادی اصولوں کے پابند نہیں ہوتے۔یا فلاں مذہب کو مانتے ہیں لیکن نہ صرف یہ کہ انھیں اس مذہب کے اصولوں کی خبر نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے اعمال سے ان اصولوں کو روندتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقتاً ایسے افراد کو اس دین یا مذہب کا ماننے والا نہیں کہا جاسکتا چاہے ظاہراً وہ خود کو اس دین کا ماننے والا سمجھتے رہیں۔اس دین کے مخالفین بھی ایسے لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔اور انھیں ان سے کوئی خوف وہراس نہیں ہوتا۔بلکہ مخالفین بھی انھیں اس دین کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔

درحقیقت کسی بھی دین یا مذہب کا قائل ان افراد کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے جو مکمل طریقہ سے اس دین کے اصول ونظریات کے پابند ہوں اور اس دین کی راہ میں جان یا مال قربان کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔

مذہب تشیع اور شیعوں کے بارے میں بعینہ یہی صورتحال ہے یعنی ہوسکتا ہے کہ بے شمار افراد

شیعۂ علیؑ یا شیعۂ اہلبیتؑ ہونے کے دعویدار ہوں لیکن یہ دعویٰ محض زبانی اور لفظی ہو اور یہ حقیقت ان کے دل میں جاگزین نہ ہو، شیعیت کے مبانی اور اصول کے پابند نہ ہوں تو ایسے افراد کو کسی بھی قیمت پر عقیدہ کے اعتبار سے شیعہ نہیں کہا جاسکتا۔

عقیدہ کے لحاظ سے حقیقی شیعہ وہ ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ امام کا قاتل نہیں ہوسکتا، بلکہ امام کی حفاظت کے لئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ جیسا کہ روز عاشور، کربلا میں دنیا نے دیکھا کہ تھوڑے سے وہ افراد جنھیں کربلا کی جانب امامؑ کی روانگی اور آپؑ کے قیام کی اطلاع ملی تو انھوں نے حد درجہ ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو امام تک پہونچایا اور عشق ومحبت سے سرشار ہو کر انتہائی خلوص کے ساتھ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

اعتراض اور سوال کرنے والوں پر بھی خود یہی اعتراض کیا جاسکتا ہے، ان سے بھی یہی سوال کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی ممالک میں جتنے افراد ہیں کیا وہ واقعا اور حقیقتا مسلمان ہیں؟ وہ اسلام کے تمام اصول ومبانی کے پابند ہیں، یا نہیں؟

نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایسے مسلمان بھی ہیں کہ جو اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں، اور عالمی سامراج کے نوکر ہیں۔ کیا اسلامی ممالک میں ایسے افراد یا گروہ نہیں ہیں کہ جو اسلام ومسلمین کے خلاف کفار اور سامراجی طاقتوں کے ذلیل غلام اور خدمتگذار بنے ہوئے ہیں؟ آپ بھی یقینا ایسے افراد کو حقیقی مسلمان نہیں تسلیم کریں گے، ان لوگوں نے صرف اپنے اوپر اسلام کا لیبل لگا رکھا ہے۔

یہی کیفیت شیعوں کی بھی ہے کہ ہوسکتا ہے کچھ لوگ عقیدہ کے اعتبار سے خود کو شیعہ کہتے ہوں لیکن عقیدہ کے مطابق ان کا عمل نہ ہو اور وہ لوگ شیعہ اصول ومبانی کے پابند نہ ہوں۔

استاد شیخ علی آل محسن کہتے ہیں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ شیعہ ہی امام حسینؑ کے قاتل ہیں،، ان کے کلام میں تضاد اور تناقض پایا جاتا ہے اس لئے کہ امام حسینؑ کا شیعہ اسے کہا جاتا ہے جو امام کا ناصر، محب اور مطیع وفرمانبردار ہو اور یہ دونوں باتیں ایک ساتھ درست نہیں ہوسکتیں، یعنی یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص امام کا محب ومطیع بھی ہو اور قاتل بھی! کیا شیعہ قاتل ہوسکتا ہے؟ بہ فرض محال اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ شیعوں نے امام حسینؑ کو شہید کیا ہے تو ایسے افراد اس عمل کی بنا پر شیعیت سے

خارج ہوجائیں گے۔ (للہ وللحقیقۃ، ص ۹۷)

سید محسن امین عاملی اس اعتراض کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: خدا کی پناہ! بھلا حقیقی شیعہ بھی امامؑ کے قاتل ہو سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے آپؑ کو شہید کیا، ان میں کچھ حرص و ہوس کے بندے تھے انھیں دین سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور کچھ انتہائی پست اور اہل شر تھے، کچھ اپنے رؤساء کے پیروکار تھے جنھیں حب دنیا نے ایسے عظیم جرم پر آمادہ کیا۔ امامؑ عالی مقام کا کوئی محب یا شیعہ آپؑ کے خلاف قتال میں شریک نہیں تھا۔

جو آپؑ کے حقیقی اور مخلص شیعہ تھے وہ سب کے سب آپؑ کے معین و یاور تھے اور آخری دم تک آپؑ کے ہمراہ رہے اور آپؑ ہی کے ہمراہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے، انھوں نے بھرپور کوشش کی اور آخری سانس تک امامؑ کی نصرت کرتے رہے۔

کچھ ایسے شیعہ بھی تھے جن کے لئے واقعا نصرت کا امکان نہیں تھا، بعض کا خیال تھا کہ نوبت یہاں تک نہیں پہونچے گی کہ امام شہید کردئے جائیں گے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے خطرات مول لے کر کوفہ کے گرد ابن زیاد کے حصار کو توڑا اور جان کی بازی لگا کر جیسے بھی ممکن ہوا امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، بہرحال یہ کہنا کہ شیعہ بھی آپؑ کے قتل میں شریک تھے ایسا ہرگز نہیں تھا۔

(اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۵۸۵)

کوفی کیسے شیعہ تھے؟

تاریخ کا دقیق مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے بعد خاص طور سے امام حسنؑ کے زمانۂ امامت میں اہل کوفہ عام طور پر سیاسی شیعہ تھے، عقیدہ کے اعتبار سے نہیں۔ یعنی وہ لوگ صرف خلیفۂ سوم یا دوسرے تمام صحابہ پر حضرت علیؑ کی فضیلت کے قائل تھے اور حضرت علیؑ اور دوسرے ائمہ معصومینؑ کی منصوص امامت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور یہ طے ہے کہ سیاسی شیعوں کو صحیح العقیدہ شیعوں کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہمارے اس دعویٰ پر مندرجہ دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں:

ابن عساکر نے اپنی کتاب ''تاریخ دمشق'' میں اپنی سند کے ساتھ حریث بن ابی مطر سے نقل کیا

ہے کہ میں نے مسلمہ بن کہیل کو کہتے ہوئے سنا ہے: کہ میں مسیب بن نجبۂ فزاری کے ساتھ مسجد کوفہ میں بیٹھا ہوا تھا، اس جگہ کافی شیعہ موجود تھے ہم نے ان سے اسکے سوا کچھ نہیں سنا کہ وہ سب کسی نہ کسی صحابی پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور انکی تعریف کر رہے اور انکی تمام تر گفتگو کا محور حضرت علیؑ وعثمان تھے۔

اہلسنت بغیر استثناء تمام صحابہ کی مدح کر کے ان کو عادل سمجھتے ہیں اور جن لوگوں کو سیاسی شیعہ کہا جاتا ہے صرف وہی لوگ عثمان پر حضرت علیؑ کی افضلیت کے قائل تھے۔ کوفہ میں کچھ لوگوں کا یہی عقیدہ تھا اور کچھ لوگ تو اس حد تک بھی حضرت علیؑ کے بارے میں عقیدہ نہیں رکھتے تھے جیسا کہ ابن عساکر کی روایت سے معلوم ہو چکا ہے۔

★★★★★

مدح امام جعفر صادقؑ

علامہ ذیشان حیدر جوادی طاب ثراہ

خلاق دو عالم کا ایسا شہ کار امام صادق ہیں
سرکار رسالت کا زندہ کردار امام صادق ہیں

اسلام کے ہر منصب کیلئے اقرار امام صادق ہیں
اور کفر کے ہر مذہب کیلئے انکار امام صادق ہیں

قدرت نے عطا کی ہے ان کو پروازِ نظر کی وہ طاقت
مذہب کی ہر اک خدمت کے لیئے تیار امام صادق ہیں

گر دین خدا پر حملہ ہو بن جاتے ہیں یہ مذہب کی سپر
باطل جو اُٹھائے سر اپنا تلوار امام صادق ہیں

سب اہل ستم ان سے بھاگے ٹھہرا نہ کوئی ان کے آگے
فرار ہیں سارے اہل ستم کرّار امام صادق ہیں

منصور کا ناصر کوئی نہیں اس رہ کا مسافر کوئی نہیں
اب قافلہء حق کے تنہا سالار امام صادق ہیں

جو دینِ خدا کا ہو جو یا اس کے لئے ہیں قرآں گویا
دشمن کے لیئے اک فولادی دیوار امام صادق ہیں

ایمان کی ہر حکمت اُن سے اسلام کی ہر وسعت اُن سے
ہے علم اگر اک نقطہء باپرکار امام صادق ہیں

جو امتِ حق میں شامل ہو جو جتِ حق میں داخل ہو
لازم ہے اُسے یہ یاد رہے سردار امام صادق ہیں

مالک سے اگر تصدیق نہیں پھر کوئی بشر صدیق نہیں
اور دہر کی ہر سچائی کا معیار امام صادق ہیں

شہادت حضرت علی اصغرؑ اور امن عالم

پروفیسر شاہ محمد وسیم صاحب، علی گڑھ

اگر کسی سے کہا جائے کہ وہ دنیا کی تمام مصیبتوں، تکلیفوں اور مسائل کی وجہ کو صرف ایک لفظ میں بیان کردے، تو وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے، ناخواندگی، جہالت، غربت، بے راہ روی، راہ اعتدال سے انحراف اور اسی طرح کچھ اور بھی۔ لیکن وہ ایک لفظ، جو تمام وجوہات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، ناانصافی ہے کہ یہ ناانصافی اور عدل کا مفقود ہونا ہی ہے، جو دنیا کے تمام مسائل اور صعوبتوں کا باعث ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے: "اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى"۔ (المائدہ:۸)

اسی عدل کو پیغمبرؐ اور ان کے اہلبیتؑ نے ہمیشہ قائم کیا، جارج جرداق (George Jordac) نے اپنی کتاب "صوت العدالة الانسانیه" میں لکھا ہے: ''علیؑ کی پالیسی کا بنیادی نکتہ انسانوں کی خدمت کرنا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا اور ناانصافی کو ختم کرنا تھا۔'' علیؑ کے بعد کے معاشرہ پر غور کریں اور ان کے اقدامات پر، جنہوں نے اقتدار حاصل کرلیا تھا، تو عوام عدل کی آرزو لئے بس زندگی گزارتے ہوئے نظر آئیں گے!

عالمی سطح پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں رونما ہونے والے خون خرابہ، صعوبتوں اور مسائل سے کون واقف نہیں ہے؟ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ بستیاں تاراج ہوگئیں۔ انسانیت کراہ اٹھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ (Cold War) نے انسان کو آن گھیرا۔ اب جہانی (Globalisation) کا نعرہ بلند کیا جارہا ہے، لیکن استحصال کارفرما ہے۔ تلاش امن، صلح و آشتی کی

جستجو میں انسان آج بھی روگرداں اور پریشان ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ طے پایا کہ دنیا کی حکومتوں سے امن عالم کی اپیل کی جائے مگر سوال یہ تھا کہ یہ اپیل کس کے نام پر کی جائے؟ آخرش یہ طے پایا کہ کربلا کے معصوم ننھے مجاہد حضرت علی اصغرؑ کے نام پر یہ اپیل کی جائے۔ فرانسیسی شاعر الیکزینڈر گوئینے (Alexandre Goenel) نے حضرت علی اصغرؑ کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے توسط سے امن عالم کی اپیل کی کہ اس ننھے مظلوم کی مظلومیت پر کسی کا دل بھر نہ آئے گا؟ کون ہوگا جو ان کے نام سے امن کی اپیل پر کان نہ دھرے گا؟ اس نظم کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور اسے دنیا کی تمام حکومتوں کو اور لیگ آف نیشن (League of Nations) کو بھی، جو اقوام متحدہ (U.N.) کا پیش رو ادارہ تھا، بھیجا گیا اور ساتھ ہی اسکا انگریزی ترجمہ اخباروں میں بھی شائع کیا گیا۔

واقعۂ کربلا ہر انسان کا دل ہلا دیتا ہے، خصوصاً شہادت علی اصغرؑ کہ کہاں تین دن کا بھوکا پیاسا چھ ماہ کا نونہال اور کہاں تیر ظلم جس سے اس کا گلہ چھد گیا۔ کربلا میں ایک طرف یزید ملعون اور اسکے درندوں کا ظلم اپنی حدوں کو پار کر رہا تھا اور دوسری طرف حسینؑ اور ان کے ساتھ والوں کا صبر و شکر تاریخ عالم میں خدا پرستی کی مثال قائم کر رہا تھا۔ بقول جعفر حسین منظرؔ لکھنوی:

شہید کربلا کے حوصلے تھے دید کے قابل　　وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا

اور مظلومیت کا عالم یہ تھا کہ بقول میر نفیس:

ترس کسی کو نہ بچّہ کے حال پر آیا　　تمہارے لال کو رن میں لے جا کے پچتایا
لحد تو مل گئی، لیکن کفن نہیں پایا　　اسی لہو بھرے کرتہ میں اسکو دفنایا
وفور غم سے نہیں تاب صبر ہے بانو!　　وہ سامنے علی اصغرؑ کی قبر ہے بانو!

الیکزینڈر گوئینے کی بعض حصّوں کا ترجمہ [از مصنّف مضمون ہذا] قارئین پیش خدمت ہے۔

یہ شاعر کہہ کر حضرت علی اصغرؑ کو عقیدت پیش کرتا ہے کہ:

اس خود مختار [شہنشاہ] کو
اس باعظمت فاتح کو

اس رخشندہ نامور آزادی دھندہ کو
اس پرافتخار امن قائم کرنے والے کو
اس عظیم و معزّز شہید کو
[جو] اطفال میں [ہے] ستارہ
[اور ہے] معصوم بچوں میں حاکم ہمارا
[کہ نام نامی ہے جسکا] علی اصغرؑ
علی اصغرؑ ہر اک طفل کے لئے ملکوتی ستارہ
زخمی ابدانی اور فتح یاب قلوب پہ حاکم
وقت تری طرف خود (ہی) ہے بڑھتا، لامتناہی پیاسا [پیاسا]
ابدی محبت کا شعلہ [بن کر]، جسے تو نے عطا کیا ہے روحوں کو ہماری
شہادت تری درمیان ریگزار [کہ تھا] پرآشوب
کربلا میں، بازوؤں میں اپنے پدر کے، [جاں سے] قریب
رہے گا ہمیشہ ساتھ ہمارے، تیرے پرشوق عقیدتمندوں کے
وہ جُرم جسے ہم صدا کریں گے یاد، بہ نرغۂ تمام تر افسوس و غم کے
یہ شہادت [تیری] اور وہ جرم [ان کا]
ہجوم میں ہزاروں غموں کے
اس ریگزار میں دیکھا تھا جس نے تیری قضا و تیری فتح کو
[جو] ہمارے دلوں میں محبت کو تیری کرتا رہے گا دوبالا
تیرا جواں خون جو بہا تھا نام پر آبرو کے
بمثل اس ڈوبتے سورج کے جو خود اپنے اوج پر ہوا رغوانی
[اے] بادشاہوں کے شہنشاہ، تمام حکمرانوں میں سربلند [عظیم]
مابین سبھی فاتحان [عالم بہ اوج] سرخرو

اور ظالم کہ ہیں خائف جس سے سب سے زیادہ
تامین کنندگانِ دوزخ، خود انجام سے اپنے
کہ اس دن سے پہلے کتنے ہی لوگوں پہ کی تھی انھوں نے حکمرانی
انھیں محکوم کرنے اور زمین [خدا] کو سَر کرنے انقلاب [بد] سے اپنے
تصوّر کر سکتے ہو کیا تم اس رنج و مصیبت کا؟
تو یاد کرلوں ان شریر و نابکار افراد کو، بھرپور تباہ کن نفرتوں کے حامل
[جنھوں نے] خود اپنے کو دے دیا تھا اک ظالم و جابر کو کہ تھا وہ خود سر
اور انھوں نے جرم کی کی تھی طرفداری، بے شرمی کے ساتھ کالے کرتوتوں پہ اپنے
کہ چھوٹے معصوم بچّوں پہ ایک قطرہ آب تک بند کر دیا تھا
اور وہ ظالموں کے وحشیانہ وار کا شکار بن گئے تھے
مگر تیری شہادت ریگزار میں ان تپتے پتھروں کے درمیاں،
[اب] خباثت پر ظالموں کی تا ابد گواہ ٹھہری
جنھوں نے تجھے کیا تھا حوالہ شدید تشنگی میں قضا کے
اور موت سے ہمکنار ہونٹوں نے تیرے
یک قطرۂ آب کی عنایت سے پھیر لیا تھا خود منھ ہی اپنا
تیرا انجام [نیک] اس جلتے، تپتے صحرا میں
اس چمکتے [گرم] سورج نے
تیری مظلومیت کو اور بھی دوبالا کر دیا تھا، اے ننھے [معصوم علی اصغرؑ]
گیتی! تو تو تھی واں دیکھنے کو [خون کی] فتح جنگ پر
اِک ہیرو کی، لگا کر موت کو خود اپنے گلے سے کہ جو بن گئی تمام عالم کی قربانی
اے طفل [نامور]! تو ہے دنیا کی قوموں میں بلند و بالاتر
کہ بلند ہوا ستاروں میں اک [تابناک] ستارہ بن کر

خود اپنے بزرگ و باعظمت پدر کے بازوؤں میں
شہادت نے تری ریگزار کے ذرّہ ذرّہ کو عطا کی حاصل خیزی
کہ تو ہر دل میں منارہ محبت کا بن کے ہے ابھرا
ماؤں! اے [دنیا بھر کی] ماؤں! توصیف کرو اور کرو دعائیں!
اک طفل [شیر خوار] تھا علی اصغرؑ، ذرا کرو تو تصوّر
کہ ہمارا پیارا [ننھا] آقا! [بہادر] ہیرو بن کے لگتا ہے کیا؟
کہ اسکی بردبار [زندگی اور] جاں کو کہ جو تھی موت تک بھوکی پیاسی، بدونِ امداد
[ظلم نے] یک لمحہ کی بھی نہ دی تھی اجازت
کہ ملتی شدت پیاس میں کرب سے ذرا تو راحت
کہ کبھی نہ سیر ہونے والے ظالموں کے وہ پست قالب
ذرا بھی احساس نہ تھا جن میں معصومیت کا تمہاری
لیکن آسماں کے سارے فرشتے دیکھ کر طاقت و توانائی تمہاری
[ہاں] ایک ننھے [معصوم] کی طاقت و توانائی
اے شاہوں کے شہنشاہ اعلیٰ! قوت کو تمہاری، تمہاری محبت میں برداشت کر لیا تھا۔
ایسے تھے شیریں و سبک سر الفاظ
غمزدہ حسین [علیہ السلام] کے
کہ سر تھا ان کا جھکا ہوا سوئے زمیں
اور نگاہ ان کی کہ تھیں آسماں کی طرف
اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے
خون آلود جسم خود اپنے پسر کا
آہستہ، [ہاں! آہستہ] سے دعا یہ کرتے ہوئے
'تجھے سونپتا ہوں میں، میرے محبوب' مالک کل!

موت سے ہمکنار جسم اپنے پسر علی اصغرؑ کا
کہ تھا مانند اگتے ہوئے نڈر چاند کے
اسے میرے لئے پاس اپنے رکھنا، اور ہم کو بھی یک ساتھ صدایوں ہی
دن کو فیصلہ کے
دن کو نورانی روشنی کے
جب سب ہوں گے حاضر
پیش واسطہ عدلِ خدا کے
خدا کی عدالت کے حضور
سب ہی ہوں گے حاضر، نہ ہوگی ہمّت کسی کو نظر تک اٹھانے کی
تب اے علی اصغرؑ! [آقا ہمارے] پھول باغ جناں کے
کھول دو گے واسطہ ہمارے اسکا نورانی باب [بہشت]
کیونکہ تمھارے [مظلوم] پدر نے تمہیں قرباں کیا تھا
مالک دو جہاں، مالک بہشت کیلئے
تیری شہادت نے، اے آقا ہمارے علی اصغرؑ
ہمارے دلوں پر [نام تیرا] بہشت کر دیا ہے
نام تیرا رہے گا یوں ہی صدا لبوں پہ ہمارے جاری
اپنے مقام [پرعظمت و] بلند سے دعا کرو واسطے ہمارے
ایک سنہرے دور کی تا کہ عدل [ہمارے لئے]
بہم ہو اور رہے صدا جاری و ساری

★★★★★

ھدیٰ مشن
کے زیر اہتمام جاری دینی خدمات میں حصہ لے کر تبلیغ کے قافلہ میں شامل ہوں

لبیک یا حسینؑ

عالیجناب مولانا سید پیغمبر عباس صاحب

کربلا میں امام حسینؑ نے اپنے اعزاء واقرباء کی قربانی پیش کرنے کے بعد جو استغاثہ بلند فرما کر اپنے چاہنے والوں کو اپنے مشن کی نصرت کے لئے بلایا تھا وہ آج بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے، جنگوں میں اپنے چاہنے والوں سے مدد طلب کرنا عام بات ہے مگر یہ مدد یا تو جنگ سے پہلے طلب کی جاتی ہے یا پھر اُس وقت کی جاتی ہے جب جنگ شکست کے قریب پہنچ جائے، لیکن کربلا میں امام حسینؑ کا استغاثہ نہ تو جنگ سے پہلے تھا اور نہ ہی اس خدشہ میں تھا کہ جنگ میں شکست ہو رہی تھی، اگر ہم ایسا سوچ لیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سب کی شہادت کے بعد مدد طلب کر کے امام حسینؑ صرف اپنی جان بچانا چاہتے تھے باقی کسی کی جان کی آپ کو پرواہ نہ تھی (نعوذ باللہ)۔

امام حسینؑ اپنے یاور وانصار کی شہادت کے بعد استغاثہ بلند کر کے ہمیں بہت ہی اہم زندگی ساز پیغام دے رہے تھے، اسی لئے امام عالی مقام کا یہ استغاثہ صرف کربلا کے میدان میں روز عاشور تک محدود نہ تھا آج بھی امامؑ کا استغاثہ ہمیں اُس مقدس مشن کی مدد کے لئے آواز دے رہا ہے جس کی داغ بیل امام حسینؑ نے کربلا میں ڈالی تھی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ائمہؑ کے اقوال کی روشنی میں یہ مفہوم نہ ہوتا کہ ''ہر زمین کربلا ہے اور ہر روز عاشور ہے''، یعنی جس سرزمین پر جب بھی یزیدیت سر ابھارے اور اسلامی معاشرے کو نقصان پہنچائے تو وہ سرزمین، کربلا ہے اور وہ دن عاشور کا دن ہوگا، جب بھی ایسا ہو تو ہر حسینی کا فرض ہے کہ وہ امام حسینؑ کے استغاثے کا جواب ''لبیک یا حسینؑ'' کی شکل میں دے کر یزیدیت سے مقابلہ کے لئے نکل پڑے، ایسا کرنا ہر مسلمان پر انفرادی اور اجتماعی طور پر فرض ہے۔

اسلام نے معاشرے کے انفرادی (ایک فرد) اور اجتماعی (سماجی) مفادات کے تحفظ کی تاکید کی ہے، اسی لئے ہر فرد پر یہ دونوں ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اگر اجتماعی امور کی انجام دہی کے لئے زمین ہموار نہ ہو تو صرف انفرادی ذمہ داری ہی عائد ہوتی ہے، ارشاد الٰہی ہے: اے ایمان والو! تم اپنے نفس کی فکر کرو، اگر تم ہدایت یافتہ رہے تو گمراہوں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

(سورۂ مائدہ، آیت ۱۰۵)

اور جب اجتماعی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے حالات سازگار ہوں تو اس وقت انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کو بھی انجام دے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: تم میں سے ہر ایک پر اجتماعی مسئولیت عائد ہوتی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔

(بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۳۸)

دین اسلام نہ تو کیپٹل ازم کی طرح صرف انفرادی مفادات کی بات کرتا ہے اور نہ ہی کمیونزم کی طرح صرف اجتماعی مفادات کی ضمانت فراہم کرتا ہے بلکہ حالات کے مطابق دونوں ذمہ داریاں ضروری ہیں۔

امام حسینؑ کی امامت کا زمانہ ایسا ہی تھا جس میں مسلمانوں پر انفرادی اور اجتماعی دونوں ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، چونکہ بنی امیہ کی سیاست نے معاشرے کو انفرادی اور اجتماعی طور پر برباد کر کے رکھ دیا تھا، ان کے ذریعہ پھیلائے گئے قبائلی اور خاندانی تعصب اور قبیلہ پرستی نے مسلمانوں کو ان مقاصد تک پہنچنے ہی نہ دیا جن تک جانے کی اسلامی تعلیمات نے ترغیب دلائی تھی، بلکہ مسلمان قبائلی حدود میں بند چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھتے رہے لہٰذا اس سیاست نے مسلمانوں کو انقلابی عمل سے باز رکھا اور محرومیت ونکبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا، دوسری جانب بنی امیہ نے ''مرجئہ'' فرقے کے گمراہ عقیدے کو اپنی غیر اسلامی سیاست کو مذہبی رنگ دینے کے لئے استعمال کیا اور اس عقیدہ کی ہر سطح پر حمایت کی اور لوگوں میں رائج کر دیا، جسے آج تک مسلمان سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

اس کی بنیاد پر بنی امیہ بالخصوص معاویہ لوگوں کو یہ سمجھاتے تھے کہ حکومت کا وجود اور اس کے کارنامے چاہے کتنے ہی غیر اسلامی اور ظالمانہ کیوں نہ ہوں تقدیر الٰہی ہیں اور کسی بھی صورت میں تغیر و

تبدل کے لائق نہیں ہیں لہٰذا بنی امیہ کی حکومت کی مخالفت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس گمراہ عقیدے سے معاویہ نے بہت فائدہ اٹھایا اور اپنی تمام بداعمالیوں کو تقدیر الٰہی کا نام دے کر حکومت کرتا رہا اور لوگوں کو یہ باور کراتا رہا کہ میں اسلامی خلیفہ ہوں اور کیسا ہی گناہ کیوں نہ انجام دے لوں مقام خلافت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

دراصل مرجئہ فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ اچھے اور برے اعمال میں بندہ کو اختیار نہیں ہے بلکہ ہر خیر و شر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے (نعوذ باللہ) اسی طرح اموی سیاست کے تیسرے ستون یعنی ''مذہب ہی کو مذہب کے خلاف استعمال کرنے'' سے اس وقت کے اسلامی معاشرے کو کتنا نقصان پہنچا اس کا اندازہ اس کے انفرادی، اجتماعی اور دینی مخدوش حالات سے بخوبی ہوجاتا ہے کہ کس طرح مسلمان اس پر اعتراض کرنے اور حالات کو درست کرنے کے لئے کوشش کرنے سے کتراتے تھے جس کے نتیجے میں معاشرے کے ضمیر میں گناہ کا شعور ہی مردہ ہوگیا تھا۔

جبکہ یہی شعورِ گناہ اگر زندہ ہوتا تو ایک انقلاب کے لئے بنیاد بن سکتا تھا اور جب یہ شعور مردہ ہوجاتا ہے تو معاشرے پر موت کی سی خاموشی چھا جاتی ہے لہٰذا وہ مسلمان جو پوری انسانیت کا درد سینے میں رکھتے تھے اور دوسروں کے دکھ درد کو کم کرنے کے لئے ہمیشہ سعی و کوشش میں لگے رہتے تھے ان کو اس اموی سیاست نے قبیلہ پرست بنا کر اپنے ہی قبیلے کے محدود دائرے میں مقید کردیا تھا اور عیناً زمانہ جاہلیت کی طرح قبائلی اور خاندانی اختلافات تک محدود ہوکر رہ گئے تھے، ان کی شخصیتیں قبائلی چہار دیواری سے باہر نکل کر دوسرے میدانوں میں نہ ابھر سکیں۔

دور جاہلیت میں بھی یہی چیز کارفرما تھی جو بنی امیہ کے دور اقتدار میں دوبارہ زندہ ہوگئی تھی، جس کی طرف معروف اہل سنت دانشور اور عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یوں اشارہ کیا ہے: ''دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی راہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ (بنی امیہ) حاوی ہوگئے تھے جنھوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی، خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانے کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انہوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت نہیں پائی تھی، ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملت اسلامیہ کے راہنماؤں کے شایان شان ہے، ان

کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول (دور جاہلیت) سے بالکل آزاد نہیں ہوئی تھیں۔
(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۱۶۳)

لہٰذا جب اموی خاندان کے فاسق وفاجر یزید بن معاویہ نے اسلام سے انسانی اقدار کو نکال پھینکا اور اسلام کو ایک خاص ٹولے کے مفاد میں استعمال کرنے لگا تو امام حسینؑ نے اسلام کا دفاع کیا اور انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو کما حقہ پورا کر دیا، البتہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا اس راہ میں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اسلامی معاشرے کو وہ جرأت عطا کر دی کہ پھر کبھی کسی ظالم کے سامنے مسلمان خاموش نہیں رہے اور انقلاب کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امام حسینؑ کے اس انقلاب کو ''حسینی انقلاب'' کہا جاتا ہے، حسینی انقلاب میں محبت و ہمدردی اور ایثار وفداکاری کا بے مثال نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ محبت و ہمدردی جلادوں اور قاتلوں تک کے ساتھ بھی تھی جن کو ظالم حکمران نے دھوکہ دے کر ان شخصیتوں کے ساتھ لڑنے بھیجا تھا جو خود انہی کی بھلائی چاہتی تھیں اور ان جانبازوں نے اس محبت کا مظاہرہ روز عاشور آپس میں بھی کیا جو موت کی طرف ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے تھے تاکہ اپنے ساتھی کے قتل کا منظر دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہیں۔

ان کے مقابلہ میں یزیدی لشکر تھا جو بدترین کینے اور عداوت کا مظاہرہ کر رہا تھا، جس نے حسینی جانبازوں اور ان کے کمسن بچوں کو پانی تک سے محروم رکھا اور عورتوں اور بچوں تک کا خون بہانے سے باز نہیں آیا جس سے ہر انسان کا دل کانپ جاتا ہے اور اسی چیز نے اس انقلاب پر لکھنے اور بولنے والوں کی توجہ اپنی طرف اس طرح مبذول کرائی کہ انہوں نے اس انقلاب کے صرف انہیں واقعاتی پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں، حالانکہ حسینی انقلاب میں تعلیم وتربیت، اخلاق وکردار، ایثار وفداکاری کی بے شمار خصوصیات موجود ہیں بلکہ یہ انقلاب ایک درسگاہ ہے جو صرف واقعات تک محدود نہیں ہے، دنیا میں اب تک بے شمار انقلاب آچکے ہیں لیکن جو اثر سن ۶۱ ہجری میں عراق کے شہر کربلا میں رونما ہونے والے حسینی انقلاب کا ہے وہ کسی کا نہیں ہے۔

حسینی انقلاب کی یاد ہر سال محرم میں دنیا کے گوشہ گوشہ میں منائی جاتی ہے، دنیا میں رونما ہونے

والے دیگر انقلابوں کا مقصد اقتدار پر قبضہ ہوتا ہے لیکن حسینی انقلاب میں اقتدار پر قبضے کی کوئی خواہش کسی کو نہ تھی اگر چہ خلافت و اسلامی حکومت قطعی طور سے امام حسینؑ کا حق تھا جسے یزید غصب کئے بیٹھا تھا۔ حسینی انقلاب نے تمام انصاف پسندوں کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور باشعور لوگ اس انقلاب سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں، اس انقلاب نے تمام حریت پسندوں کے دلوں میں اس طرح جوش و ولولہ بھر دیا ہے جس سے وہ ہر بڑی طاقت کے مقابلے پہ آجاتے ہیں، چاہے گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان کا انقلاب آزادی ہو، یا پھر امام خمینی کی قیادت میں ایران کا اسلامی انقلاب ہو اور یا سپر پاور امریکہ کو انگلیوں پر نچانے والے اسرائیل کے خلاف حزب اللہ کی مزاحمت ہو سبھی میں حسینی انقلاب کے اثرات نمایاں ہیں، غرض حسینی انقلاب کے بعد دنیا میں ظالم و جابر حکمرانوں اور حکومتوں کو ہمیشہ انقلاب کا ڈر لگا رہتا ہے۔

امام حسینؑ کا یہ عظیم انقلاب کسی شخص، گروہ خاندان اور حکومت کے خلاف نہیں تھا بلکہ یہ انقلاب اُن سماجی برائیوں کے خلاف تھا جنہوں نے اسلامی معاشرے کے تانے بانے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔

امام حسینؑ کا یہ عظیم انقلاب کسی شخص، گروہ خاندان اور حکومت کے خلاف نہیں تھا بلکہ یہ انقلاب اُن سماجی برائیوں کے خلاف تھا جنہوں نے اسلامی معاشرے کے تانے بانے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے، جس کا ذمہ دار اموی خاندان اور پشت پناہ بنی امیہ کی حکومت تھی جس کے پُرتشدد، دباؤ اور استحصالی سیاست نے لوگوں کے دلوں سے جذبۂ آزادی کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔

جس دن سے شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تھا شام والوں نے ''خالد بن ولید'' اور ''معاویہ بن ابی سفیان'' جیسے حاکموں کو دیکھا تھا، شام والے نہ تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے اور نہ ہی اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روش سے آشنا تھے اور نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل البیتؑ کو جانتے تھے اور نہ ہی مدینہ میں رائج اسلام کے بارے میں کچھ خبر رکھتے تھے۔

البتہ تاریخ میں ۱۱۳، اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعداد ضرور ملتی ہے کہ جو، یا تو سرزمین شام کو فتح کرنے میں شریک تھے یا آہستہ آہستہ وہاں مقیم ہو گئے تھے ان میں بھی اکثر ایسے تھے جنہوں نے بہت کم وقت حضورؐ کی صحبت میں گزارا تھا ان میں سے اکثر معاویہ کے زمانے میں مر چکے تھے اور امام حسینؑ کے انقلاب کے زمانے میں صرف ۱۱ افراد باقی تھے جن کی عمریں ۷۰ سے ۸۰ سال کے درمیان تھیں جو بڑھاپے کی وجہ سے گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے، اس لئے عوام میں ان کا کوئی نفوذ اور اثر نہیں تھا۔

لہٰذا شام کی وہ جوان نسل جو یزید کی ہم عمر تھی محمدیؐ اسلام سے بے خبر اور نابلد تھی ان کی نظر میں بنی امیہ کی روش اور طرز حکومت ہی اسلام تھا، اسی لئے معاویہ کے ٹھاٹ باٹ، لوگوں کے مال پر زبردستی قبضہ، بڑے بڑے محلوں کی تعمیرات، مخالفوں کو قید کرنا، شہر بدر کرنا یا قتل کرنا شامیوں کی نگاہ میں کوئی جرم نہ تھا اس لئے کہ انہوں نے ۵۰ سال تک بنی امیہ کے ذریعہ مذکورہ تمام غیر اسلامی افعال کو بنام اسلام انجام دیتے دیکھا تھا، غرض اہل شام معاویہ کے افعال و کردار کو ہی اسلام سمجھتے تھے۔

اسی لئے جب رجب ۶۰ ہجری میں معاویہ کے انتقال کے بعد یزید کو حکومت اسلامی کی باگ ڈور سونپ دی گئی تو شامیوں نے قطعاً اعتراض نہ کیا بلکہ بخوشی یزید کی حاکمیت کو قبول کر لیا جبکہ یزید کا کردار سب پر آشکار تھا، جس سے اُس زمانہ کے اسلامی سماج کی بے حسی کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح بنی امیہ نے لوگوں کو بزدل بنا دیا تھا جو اپنے اوپر یزید جیسے فاسق و فاجر حاکم کو مسلط کر لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

یزید کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ اُس کی پرورش ایک عیسائی عورت کی گود میں ہوئی ہے، کیونکہ یزید کی ماں ''میسون بنت بجدل کلبی'' عیسائی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی اور وہ بھی صحرانشین !اور اس کا شمار شام کی معروف عورتوں میں ہوتا تھا، یزید کا حمل ٹھہرنے کے بعد میسون کو معاویہ نے ایک شعر پڑھتے ہوئے سنا جس میں معاویہ اور اس کے قصر کی تمام زیبائی اور خوبصورتی نیز شام کی آب وہوا کی مذمت اور اپنے دیہات کی جھونپڑی، وہاں کی آب وہوا، گلہ گوسفند میں رہنے والے اپنے چچا زاد بھائی کی مدح سرائی کی تھی، معاویہ نے یہ شعر سن کر میسون کو طلاق دے دی، وہ حاملہ اپنے گاؤں

چلی گئی جہاں پر یزید کی ولادت ہوئی، ولادت کے بعد یزید کو ایک عیسائی عورت کے سپرد کر دیا گیا جو قبیلہ طائف سے تعلق رکھتی تھی، برے اور قبیح کام اس کے معمول تھے۔

(تفسیر سیاسی قیام امام حسینؑ، تالیف سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی، ص ۳۲۵)

تربیت کا دوسرا دور وہ ہوتا ہے جب بچہ استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے، اس موقع پر یزید کے لئے جس استاد اور اتالیق کا انتظام کیا گیا وہ بھی شام کا عیسائی تھا۔ (سیرۂ پیشوایان ص ۱۷۹)

اس کے علاوہ روم کے عیسائیوں سے بنی امیہ کے بڑے اچھے تعلقات تھے جس کی بناء پر روم کے عیسائیوں نے اموی دربار میں کافی نفوذ کر لیا تھا، اسی لئے یزید کے درباری مشیر بھی عیسائی تھے، جب یزید کو یہ اطلاع ملی کہ امام حسینؑ عازم کوفہ ہو چکے ہیں تو یزید نے اپنے ایک عیسائی مشیر ''سرجون'' رومی کے مشورہ پر کوفہ سے نعمان بن بشیر کو ہٹا کر عبید اللہ بن زیاد کو گورنر بنا کر بھیج دیا تھا۔ (تاریخ ابن خلدون، ج ۲، ص ۷۵)

چونکہ ابن زیاد اہل بیتؑ رسولؐ سے شدید عداوت رکھتا تھا لہٰذا اس نے آل رسولؐ کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا، اسی طرح یزید کا وزیر خزانہ اور منشی بھی دمشق کا عیسائی ''منصور بن سرجون'' تھا۔

(سیرۂ پیشوایان ص ۱۸۰ بحوالہ ''تجارب الامم'' ص ۲۱۱-۲۹۱)

اس کے علاوہ یزید کا درباری شاعر ''اخطل'' بھی عیسائی تھا اور یزید نے اسی عیسائی شاعر سے انصار کی ہجو (مذمت) کرائی تھی۔ (سیرۂ پیشوایان، تالیف استاد مہدی پیشوائی، ص ۱۷۹)

اور یزید نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لئے جس معلم اور اتالیق کا انتظام کیا تھا وہ بھی عیسائی تھا۔ (سیرۂ پیشوایان، تالیف استاد مہدی پیشوائی، ص ۱۷۹)

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کی زندگی بگڑی ہوئی عیسائیت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی جس کا اظہار یزید کے اشعار سے بخوبی ہو جاتا ہے:

رسومات حج میں سے ایک رسم ''ہرولہ'' ہے اس کی توہین کرتے ہوئے یزید اپنے اشعار میں کہتا ہے: ''میرا سورج انگور سے ہے اور اس سورج کا برج صراحی میں شراب کی گاد ہے (یہ سورج) مشرق سے دست ساقی سے طلوع کرتا ہے اور مغرب میں میرے منہ میں جا کر غروب ہو جاتا ہے، اور جب

صراحی سے جام میں شراب پلٹی جاتی ہے تو اُس کی آواز ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے حجاج حج میں دیوار کعبہ اور زمزم کے درمیان ہرولہ میں مشغول ہوں، پس اگر دین احمد میں (شراب پینا) حرام ہے تو تم اسے دین مسیح بن مریم کے نام پر لے لو اور پی جاؤ'' (مجموعہ آثار استاد شہید مطہری، ج ۱۷، ص ۶۶۴)

(جبکہ دین مسیح میں بھی شراب حرام تھی، مگر بگڑی ہوئی عیسائیت نے شراب کو جائز کر لیا تھا)، اسی طرح کے دیگر اشعار میں یزید اپنے فاسد عقائد کا اس طرح اظہار کرتا ہے: اے میرے ہم پیالہ دوستو! اٹھو اور اچھی آوازوں والے گانے سنو، شراب کے پیالے پے در پے پی جاؤ اور معنوی ذکر (یادِ قرآن) کو چھوڑ دو'' گانے کی آوازیں مجھے اذان کی آواز سننے سے روک لیتی ہیں، میں نے جنت کی حوروں کے بدلے (جو کہ ادھار ہیں کیونکہ ان کا وعدہ ہی تو کیا گیا ہے) پرانی شراب کے جام (جو کہ نقد ہیں) کو انتخاب کیا ہے'' (سیرۂ پیشوایان ص ۱۷۶)

یزید کو نہ تو اسلامی حکومت کے امور میں دلچسپی تھی اور نہ ہی اسے ارکان حکومت سے کوئی ہمدردی تھی، ایک سال معاویہ نے سفیان بن عوف غامدی کی سربراہی میں رومیوں سے جنگ کے لئے ایک لشکر ترتیب دے کر قسطنطنیہ روانہ کیا اور یزید کو بھی ساتھ بھیجا، یزید اِس سفر میں اپنی محبوبہ ''ام کلثوم بنت عبداللہ بن عامر کریز'' کو ساتھ لے گیا، سفیان تو لشکر لے کر روم تک پہنچ گیا لیکن یزید دمشق کے نزدیک عیسائیوں کے ''دیر مراں'' میں اپنی محبوبہ کے ساتھ ٹھہر گیا اور عیش وعشرت میں مشغول ہو گیا، اُس زمانے میں عیسائیوں کے دیر موج مستی کے اڈے ہوا کرتے تھے۔

اُدھر اسلامی لشکر میں بُری آب وہوا کے اثر سے '' غدقدونہ'' کے مقام پر چیچک اور بخار پھیل گیا، یزید کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے یہ شعر کہا: مجھے کوئی خوف نہیں ہے کہ مسلمان سپاہی ''غدقدونہ'' میں چیچک میں مبتلا ہو کر مر جائیں جب کہ میں دیر مران کے کمروں کے درمیان نرم گاؤ تکیوں پر تکیہ کئے بیٹھا ہوں اور ام کلثوم میری بغل میں ہے''

(یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں، مرتب ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، ص ۱۸۴)

بنی امیہ کے پروپیگنڈے سے متاثر بعض نادان مسلمان یزید کی مغفرت کے سارٹیفکٹ مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرتے پھرتے ہیں جس میں اسی قسطنطنیہ کی جنگ کا حوالہ دیتے ہیں، حالانکہ

یزید قسطنطنیہ تک پہنچا ہی نہیں اور اگر پہنچ بھی جاتا اور جنگ میں شریک بھی ہوجاتا تو اس کا یہ عمل قیامت تک کے لئے گارنٹی نہیں بن سکتا تھا کیونکہ قسطنطنیہ کی جنگ کے بعد خلافت سنبھالتے ہی یزید نے تین بڑے گناہ ایسے انجام دیئے ہیں کہ جن کی پاداش اسے جہنم کے سخت عذاب کی شکل میں ضرور ملے گی۔

یزید کی عیسائیت نوازی یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ یزید نے حکومت سنبھالنے کے بعد روم کے دو جزیروں سے مسلمان سپاہیوں کو ہٹا کر اسلامی قبضہ ختم کرا کے عیسائیوں کو ہمیشہ کے لئے مطمئن کر دیا۔

> حسینی انقلاب نے تمام انصاف پسندوں کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور باشعور لوگ اس انقلاب سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں، اس انقلاب نے تمام حریت پسندوں کے دلوں میں جوش وولولہ بھر دیا ہے۔

یزید کے اس اقدام کو عیسائیت نوازی اور اسلام دشمنی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، محقق عصر مولانا محمد عبدالرشید نعمانی نے ابن کثیر کی کتاب بدایہ والنہایہ اور تاریخ طبری کے حوالے سے اس بارے میں لکھا ہے کہ: ''حضرت معاویہ کے دور حکومت میں ۵۳ ہجری میں جزیرۂ ''روڈس'' فتح ہوا اور وہاں مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی قائم کردی گئی، اس چھاؤنی کی وجہ سے بحر روم میں عیسائی فوجوں کی نقل وحرکت خطرہ میں پڑ گئی تھی، امیر معاویہ ان مجاہدین اسلام کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ہر وقت ان کی مدد پر کمر بستہ رہتے تھے مگر ان کے نالائق بیٹے نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ ان مجاہدین کو اس جزیرہ سے منتقلی کے فوری احکام بھیجے، آخر وہ بیچارے پیچھے سے رسد اور کمک منقطع ہوجانے کے ڈر سے شاہی حکم کے مطابق ''روڈس'' کو خالی کر کے اپنی زمین جائداد، کھیت اور باغات کو خیر باد کہہ کر بادل ناخواستہ وہاں سے چلے آئے اور یوں بغیر لڑے بھڑے مفت میں یہ مسلمانوں کا مفتوحہ جزیرہ نصاریٰ (عیسائیوں) کے ہاتھ آ گیا۔

اسی طرح ۵۴ ہجری میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ کے قریب جزیرہ ''ارواد'' فتح کیا تھا وہاں بھی مسلمان سات سال تک قابض رہے مگر یزید کو وہاں بھی مسلمانوں کا قبضہ ایک آنکھ نہ بھایا اور اپنے دورِ

حکومت کے پہلے ہی سال میں مسلمانوں کو وہاں سے واپسی کا حکم دے کر بلوالیا۔

(یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں، مرتب ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، ص ۳۸۷)

معاویہ نے یزید کے بعض کرتوت تو اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے پھر بھی ایسے نالائق کو امت مسلمہ پر مسلط کرنا! اور شامیوں کا بے چوں و چرا اپنا حاکم مان لینا شامیوں اور دوسرے مسلمانوں کی بے حسی، بزدلی اور بنی امیہ کے پروپیگنڈے سے متاثر ہونے کو بیان کرتا ہے، امام حسینؑ اسلامی معاشرے سے اسی بزدلی اور بے حسی کے ساتھ بنی امیہ کے چالیس سالہ پروپیگنڈے کو بے اثر کرنا چاہتے تھے تاکہ شام کے ہر گھر میں یہ پیغام پہنچ جائے کہ رسول اللہؐ کے حقیقی وارث اہل البیتؑ ہیں نہ کہ بنی امیہ۔

بہرحال یزید کا اسلام کے ساتھ رابطہ بہت کمزور تھا، وہ جس اسلام کے نام پر حکومت کر رہا تھا اسی کو پامال کر رہا تھا، یزید برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی ایک ہوس پرست آدمی تھا اور اس کے دل میں جو خواہش ابھرتی تھی وہ اسے پورا کر لیتا تھا، حد سے زیادہ خواہش پرستی کی وجہ سے وہ کسی بھی طرح تقویٰ اور زہد کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس قدر گناہ اور معصیت سے آلودہ ہو چکا تھا کہ یہ بات سب پر پوری طرح عیاں ہوگئی تھی کہ یہ مقام خلافت کا اہل نہیں ہے اور یہ چیز امام حسینؑ کے انقلاب کے لئے بہترین مجوز تھی کیونکہ اموی حکومت کے حامیوں کے لئے اس صورت میں ممکن ہی نہ رہا تھا کہ انقلاب امام حسینؑ کو رائے عامہ کے سامنے ''اقتدار کی جنگ'' یا ''خطائے اجتہادی'' کے طور پر پیش کر سکیں جب کہ معاویہ کے ہر گناہ پر بنی امیہ ''خطائے اجتہادی'' کا لیبل چسپاں کر دیتے تھے۔

یہ چیز لوگوں کو بھی اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ اس وقت یزید کی ناپاک سیرت کے مقابلہ میں انقلاب کا شرعی جواز موجود ہے، یزید کی وہ سیرت جو کسی بھی اعتبار سے دینی نہ تھی، لہٰذا دین کی حمایت اور بنی امیہ کے ظلم سے مسلمانوں کو نجات دینے کے لئے حسینی انقلاب کو اب ہر شخص قبول کر سکتا تھا، حالانکہ امام حسینؑ اسلامی معاشرے کی اس بزدلی کی وجہ سے فکرمند بھی تھے جس نے یزید کی مذکورہ نصاریٰ دوستی اور اسلام دشمنی کے باوجود اُسے اپنے حاکم کے طور پر قبول کر لیا تھا۔

امام حسینؑ سماج کی اس بزدلی اور جمود کو توڑنا چاہتے تھے اور اسلامی سماج کو ایسا دیکھنا چاہتے

تھے جو متحرک، بیدار اور فعال ہو اور آئندہ کبھی ایسے بدکرداروں کے سامنے سر تسلیم خم کہ آپ باقاعدہ طور پر قیام کا اعلان فرماتے معاویہ کے انتقال کے فوراً بعد یزید نے بیعت کا مطالبہ کر ڈالا، یعنی یزید چاہتا تھا کہ امام حسینؑ کو مجبور کر دے کہ وہ بھی معاشرے کے دیگر افراد کی مانند اموی حکومت اور خود یزید کے تمام فسق و فجور اور ظلم و زیادتی پر خاموش رہیں، اور زبان نہ کھولیں!

یزید کی جانب سے بیعت کا مطالبہ حسینی انقلاب کی اصل وجہ نہیں ہے اور نہ ہی اہل کوفہ کے خطوط کو قیام امام حسینؑ کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے، یہ دونوں وجہیں جزئی طور پر حسینی انقلاب میں موثر واقع ہوئی ہیں، یزید کے مطالبہ بیعت سے پہلے ہی امام حسینؑ اموی سیاست و حکومت پر اعتراض اور مخالفت کر چکے تھے، تاریخ کی کتابوں میں امام حسینؑ کی بہت سی تقریریں اور خطوط موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت بنتے ہیں، اسی طرح اہل کوفہ کے خطوط بھی امام حسینؑ کے انکار بیعت کے ڈیڑھ ماہ بعد ان کے پاس آنا شروع ہوئے اور اس سلسلہ کا پہلا خط عبداللہ بن سبع ہمدانی اور عبداللہ بن دال آپ کے پاس ۱۰ رمضان ۶۰ ہجری کو مکہ میں لے کر آئے۔

(تاریخ ابن کثیر، ترجمہ مولانا اختر فتحپوری، ج ۸، ص ۱۰۱۳)

اگر اہل کوفہ کی دعوت امامؑ کے قیام کا اصل سبب ہوتی تو آپ کوفہ کے حالات سے آگاہ ہونے کے بعد اپنا سفر جاری نہ رکھتے، اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ نے حضرت مسلمؑ کی شہادت اور کوفیوں کی دغا کے بارے میں خبریں سن کر پہلے سے زیادہ پُرجوش خطبے دیئے اور تقریریں کیں، کیونکہ امام حسینؑ کا مقصد یزید کی غیر اسلامی روشِ حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنا تھا، جس سے اسلامی معاشرہ منکرات اور فساد و آلودگیوں میں جکڑ گیا تھا، جس کا سرچشمہ یزید کی حکومت تھی، لہٰذا ایسی صورت میں امام حسینؑ یزید کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کو الٰہی اور شرعی فریضہ سمجھتے تھے، اور اپنے چاہنے والوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی اس انقلاب میں شامل ہو جائیں۔

یہ استغاثہ ہمیں اسی انقلاب میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا ہے اور یہ استغاثہ قیامت تک اسی طرح فضاؤں میں گونجتا رہے گا اور حسینیوں کو دعوت انقلاب دیتا رہے گا، امام کے اس استغاثے سے جہاں کربلا میں موجود شامیوں پر حجت تمام ہو گئی وہیں قیامت تک ہم پر بھی "لبیک یا حسینؑ" کے

ذریعہ امام کے استغاثے کا جواب واجب ہو گیا ہے۔

اگر ہم صرف زبان سے ''لبیک یا حسینؑ'' کہیں تو کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ عمل سے امام حسینؑ کی نصرت کریں، خدانخواستہ اگر آج سماج میں ایسی برائیاں موجود ہوں جو یزیدی سماج میں تھیں اور ان سماجی برائیوں کے مقابلے میں کوئی شخص، انجمن یا ادارہ آگے نہیں آئے تو کیا ایسا سماج حسینی ہوسکتا ہے؟ کیا ایسا سماج امام حسینؑ کے استغاثے کا جواب ''لبیک یا حسینؑ'' کی شکل میں دے سکتا ہے؟

یوں تو یزیدی بھی نماز پڑھتے تھے، قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور حج وغیرہ کے علاوہ دیگر ارکان اسلام بھی بجالاتے تھے لیکن اُن کے سماجی اور معاشرتی معاملات میں اسلام کا کوئی دخل نہیں رہ گیا تھا۔

''لبیک یا حسینؑ'' بہت مقدس نعرہ ہے اس نعرہ کو دل سے لگانے والا حقیقی حسینی بن جاتا ہے، سچا حسینی اس نعرہ کے معنی کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ:

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی تنہا اپنے لئے نہ سوچنا بلکہ پوری قوم اور سماج کی بہبودی کی فکر کرنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی نہ خود کسی پر ظلم کرنا اور نہ کسی کا ظلم برداشت کرنا

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی جھوٹ نہ بولنا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی کیسے ہی بدکردار کو اپنے اوپر حاکم نہ بنالینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی ظالم سے مظلوم کو اُس کا حق دلانے کے لئے قرآن کے مطابق فیصلہ کرنا، ظالم اور مظلوم دونوں کو آدھے آدھے پر بیٹھ جانے کو نہ کہنا!

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی عام راستوں کو تنگ نہ کردینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی امر بالمعروف کرنے والوں کو بے وقوف نہ سمجھنا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی مریضوں کو (پاگل سمجھ کر) ان کا مذاق نہ اڑانا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی دینی بھائیوں کو پریشان کرنے کے لئے اُن کے ذرائع بند نہ کردینا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی اپنی زبان کو گالیوں سے محفوظ رکھنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی یتیم اور بیواؤں کا حق نہ کھالینا۔

"لبیک یا حسینؑ" یعنی ایک دوسرے کی زمین، جائیداد اور مکان پر ناجائز قبضے نہ کر لینا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی تھانوں کچہریوں میں اپنے دینی بھائیوں کی جیب نہ لٹوا دینا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی دینی بھائیوں کے خلاف جھوٹی گواہیاں نہ دینا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی دینی بھائیوں کے خلاف انہیں ستانے کے لئے ان پر جھوٹے مقدمے قائم نہ کرنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی چندسکوں میں اپنے مذہب اور عقائد کا سودا نہ کر لینا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی حرام روزی سے اپنے بچوں کی پرورش نہ کرنا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی شادی بیاہ اور مرنے جینے میں نئی نئی بے ہودہ رسمیں قائم کر کے سماج کے غریبوں کو پریشان نہ کرنا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی ماڈرن ازم کے نام پر اپنی ناموس کو اپنے ہاتھوں بے حجاب نہ کرنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی تمام واجبات کو ان کے وقت پر ادا کرنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی تمام حرام کاموں سے پرہیز کرنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی اپنے دینی بھائیوں کو بغیر سود کے قرض دینا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی اپنے پڑوسی یا رشتہ دار کو بھوکا نہ سونے دینا "لبیک یا حسینؑ" یعنی قوم کے بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہر وقت فکرمند رہنا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی قوم کے لئے علاج معالجہ کی سہولتوں پر توجہ رکھنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی چندسکوں میں پوری قوم کا سودا نہ کر لینا "لبیک یا حسینؑ" یعنی مومن بھائیوں کی غیبت نہ کرنا۔
"لبیک یا حسینؑ" یعنی حق بات یا تحریر کی مخالفت نہ کرنا "لبیک یا حسینؑ" یعنی ایک دوسرے سے حسد نہ کرنا۔

امامؑ کے اس استغاثے سے جہاں کربلا میں موجود شامیوں پر حجت تمام ہوگئی وہیں قیامت تک ہم پر بھی "لبیک یا حسینؑ" کے ذریعہ امام کے استغاثے کا جواب واجب ہوگیا ہے صرف زبان سے "لبیک یا حسینؑ" کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ عمل سے امام حسینؑ کی نصرت کریں

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی سماج کی اصلاح کرنے والوں کی ہر طرح حمایت کرنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی چند سکوں میں اپنا ضمیر نہ بیچنا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دینا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی کسی پر ظلم ہوتا دیکھ کر خاموش نہ بیٹھنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی ماتمی انجمنوں کو سیاست کا اکھاڑا نہ بننے دینا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی ماتمی انجمنوں کی کمان مذہبی افراد کے ہاتھوں میں ہی دینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی اشعار یا خطابت کے ذریعہ امام حسینؑ کے خون کی تجارت نہ کرنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی محافل و مجالس جیسے اہم اسلامی پلیٹ فارم کو کم علم اور غیر ذمہ دار ذاکرین کے ذریعہ تباہ و برباد نہ ہونے دینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی دین پر رسموں کو ترجیح نہ دینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی دینی اداروں کی سربراہی میراث کے طور پر اپنی اولاد میں منتقل نہ کرنا

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی قومی و مذہبی سرمائے سے بنائے گئے دینی اداروں کو اپنی ملکیت قرار نہ دینا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی اوقاف کی لوٹ کھسوٹ نہ کرنا ''لبیک یا حسینؑ'' یعنی خمس و زکات کو اپنا ذاتی سرمایہ نہ سمجھنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی چند سکوں کی خاطر مرجعیت کی مخالفت نہ کرنا۔

''لبیک یا حسینؑ'' یعنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دین سے بغاوت نہ کرنا، اس نعرہ کو دل سے لگانے والا یہ بھی جانتا ہے کہ خدانخواستہ اگر کسی سماج میں یزیدی سماج کی علامتیں پائی جائیں تو اسے حسینی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے؟ کیا سماج سے مذکورہ برائیوں کو دور کرنے کے لئے صرف موجودہ رسوم عزا ہی کافی ہیں ؟! تو ان مراسم عزا سے سماج میں تبدیلی نہیں آئے گی بلکہ اس وقت ہمارے ہندوستانی شیعہ سماج کو تبدیلی اور حسینی انقلاب کی ضرورت ہے، لہٰذا اپنے سماج کو حسینی بنانے کے لئے ہمیں میدان عمل میں آکر ''لبیک یا حسینؑ'' کہنا چاہئے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔

★★★★★

تحفظ پیغام کربلا اور جناب ام کلثومؑ

عالیجناب مولانا سید نجیب الحسن زیدی صاحب

ہر انقلابی تحریک اپنے اندر دو عناصر پوشیدہ رکھتی ہے (۱) خون، (۲) پیغام، خون کی حدت جہاں تحریک کی زندگی ہے وہیں پیغام اس زندگی کی بقا ہے بس دونوں میں فرق یہ ہے کہ خون دینے والا اپنے لہو سے اپنے مقصد کی آبیاری کر کے شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے لیکن مقصد کو باقی رکھنے والا پل پل جیتا اور مرتا ہے، شہید مقصد پر قربان ہو جاتا ہے اسکا خون یہ اعلان ضرور کرتا ہے کہ ناحق قتل کیا گیا، لیکن اس قتل کے پیچھے کیا مقصد تھا یہ خون نہیں بتاتا اس مقصد کو بیان کرتی ہیں وہ ہستیاں جو شہید کے مقصد کی پاسبان ہیں۔

لہذا ہر تحریک کے لئے جہاں ضرورت ہوتی ہے خون کی وہیں ضرورت ہوتی ہیں ایسی ہستیوں کی کہ جو شہید کے مقصد کو عام کریں اسکے فلسفہ شہادت کو بیان کریں، تحریک کربلا میں بھی یہ دونوں عناصر بَہم مل جائیں گے ایک طرف خون ہے اور خون کے لئے ان پاکیزہ افراد کا انتخاب ہے کہ جن کا خون انسانی اقدار کی رہتی دنیا تک حفاظت کر سکتا ہو تو دوسری طرف وہ مقدس ہستیاں بھی ہیں جو خون جگر پی پی کر مقصد شہادت کی ترجمانی یوں کرنا جانتی ہیں کہ قاتل کا گھر ہی مقتول کی پہلی عزاداری کا مرکز بنتا ہے اور قاتل کے گھر میں ہی فرش عزا بچھا کر اپنے شہیدوں کی فتح کا اعلان کر دیتی ہیں۔

جہاں مقصد کے لئے خون دینے والا انسان ہر کوئی نہیں ہو سکتا بلکہ اسکے لئے ضرورت ہے ان بہتر افراد کی جنکی سوچ، گفتار رفتار، سب ایک ہو وہیں مقصد کی پاسبانی بھی ہر ایک نہیں کر سکتا اسکے لئے

بھی ضروری ہے کہ ان ہستیوں کا انتخاب کیا جائے جو منشاء امامت کو سمجھتی ہوں، مقصد حسینی کی گہرائیوں سے واقف ہوں، جہاں کربلا کے تپتے ہوئے ریگزاروں کو اپنے لہو سے سیراب کرنے والے بے نظیر ہیں وہیں اس قربانی کے مقصد کے پاسبان کی بھی نظیر نہیں ملتی۔ وہاں حسینؑ ہیں تو یہاں زینبؑ وہاں عباس ہیں تو یہاں ام کلثوم، وہاں قاسم واصغر ہیں تو یہاں صغری وسکینہ۔۔۔

جہاں ان لوگوں کا کہ جنہوں نے کربلا کے میدان میں قربانی دے کر دین کو بچایا ہے ہم پر حق ہے کہ ہم انکی حیات کے مختلف گوشوں کو جانیں وہیں یہ بھی حق ہے کہ جن لوگوں نے ان شہیدوں کے مقصد کو ہم تک پہونچایا ہے انہیں بھی قریب سے جانا جائے۔

بعد کربلا یوں تو اہل حرم میں ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک ایسے کردار کا حامل ہے کہ جسکے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو اپنے آپ میں ایک کتاب ہے لیکن دو شخصیتیں ایسی ہیں کہ جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے:

اور وہ ذوات مقدسہ ہیں جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ، جناب زینبؑ پر کافی کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے قلم وزبان دونوں سے آپکی لاثانی شخصیت کے بارے میں عام طور پر بیان ہوتا ہی رہتا ہے اگرچہ یہ سب کم ہے اور کسی بھی اعتبار سے کافی نہیں کہا جا سکتا لیکن بی بی ام کلثوم (علیھا السلام) کی شخصیت پر علماء اور دانشور، اور اہل تحقیق طبقے سے مزید امیدیں وابستہ ہیں:

جناب ام کلثوم:

آپکی ولادت ۶ ھجری، اور وفات قید شام سے رہائی کے ۴ مہینہ دس دن یا ۵ مہنیہ بعد مدینہ میں نقل کی گئی ہے۔

فاطمہؑ جیسی ماں۔ علیؑ جیسا باپ حسنین علیھما السلام جیسے بھائی، زینبؑ جیسی بہن ہر ایک اپنے اپنے مقام پر لاجواب ولاثانی، اور ان لاثانی ہستیوں کے درمیان آپکا وجود یقینا آپکی شخصیت کو ہر ایک کو ممتاز بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟

جسکے بھائی جوانان جنت کے سردار ہوں، باپ ساقی کوثر، بہن عالمہ غیر معلمہ ہو اور ماں شاہزادی جنت وسیدۃ النساء العالمین ہو ایسی ذات پر حق ہے کہ زمانہ ناز کرے۔

اورحق ہے کہ امام حق ایسی شخصیت کو اپنے عظیم مقصد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کرے اور اسکے کاندھوں پر اپنے مقصد کی ترجمانی کی عظیم ذمہ داری دے کر درجہ شہادت پر فائز ہوجائے کہ میں نہیں تو کیا میری بہن میرے بعد میرے پیغام کو زینبؑ کی سربراہی میں یوں عام کرے گی کہ جہاں بھی کسی کا حق مارا جائے گا یا کسی بے نوا کو ستایا جائے گا حسینی پیغام مظلوموں اور بے ساہارا لوگوں کے لئے سفینہ نجات بنکر انہیں ساحل نجات سے ھم کنار کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حسینؑ مدینہ سے نکلے تو جہاں زینبؑ کو ساتھ لیا وہیں اس چھوٹی بہن کو بھی اپنے کاروان میں شامل کرلیا جو جلالت وکرامت میں زینبؑ سے کم نہیں، اگر زینبؑ نے اپنے آتشین خطبوں سے ابن زیاد کے دربار کو لرزہ براندام کیا ہے تو ام کلثومؑ نے بھی اپنے اشعار اور خطبات سے کوفہ اور شام کے لوگوں کے دلوں کو تسخیر کیا ہے۔ سیرت وکردار پر نظر ڈالی جائے تو کہیں علیؑ کی یہ چھوٹی بیٹی علیؑ نظر آتی ہے تو کہیں غیظ میں عباسؑ۔

گو کہ مہکتا ہوا وہ پھول ہے جسمیں حسنین علیھا السلام کی خوشبو بھی ہے فاطمہ وعلیؑ کی نکہت بھی۔

تصویر زہرا سلام اللہ علیھا:

فاطمہ زہراؑ کو جب بھی کسی نے دیکھا از سرتا پا چادر میں ڈھکا دیکھا، آپکا خاص وقار، اور شخصیت کا رعب ہی آپکی ذات کا معرف ہوا کرتا تھا یا وہ گفتگو کا انداز جسمیں جب بھی کلمات دہن مبارک سے نکلتے تو یوں لگتا جیسے آیات قرآنی کا نزول ہورہا ہو یہی وہ چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر اصحاب اور دوست داران اھلبیت اطہار علیھم السلام سمجھ جاتے تھے کہ یہ رسول کی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ ہے عمر بن منذر نامی شخص بھی انہیں لوگوں میں سے ہوگا جس نے کبھی بی بی کو دربار میں خطبہ دیتے سنا ہوگا یا لوگوں سے آپکی باوقار شخصیت کے بارے میں سنا ہوگا، بعد کربلا جب اسیران حرم کو قید کر کے کوفہ اور شام کے بازاروں میں لایا گیا تو اس شخص کی نظر ایک بی بی پر پڑی اسے ایسا لگا جیسے فاطمہ از ہراؑ خود ان اسیروں کے قافلے میں ہیں پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ فاطمہؑ نہیں علیؑ کی چھوٹی بیٹی ام کلثومؑ ہے چنانچہ عمرو بن منذر ہمدانی کہتا ہے میں نے جناب ام کلثوم (علیھا السلام) کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا آپ نے اپنے چہرے کو چھپایا ہوا تھا ایک پھٹی ہوئی پرانی چادر سر پر تھی، مجھے ایسا لگا جیسے بی بی فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیھا) کو دیکھ رہا ہوں۔ (منتھی الآمال)